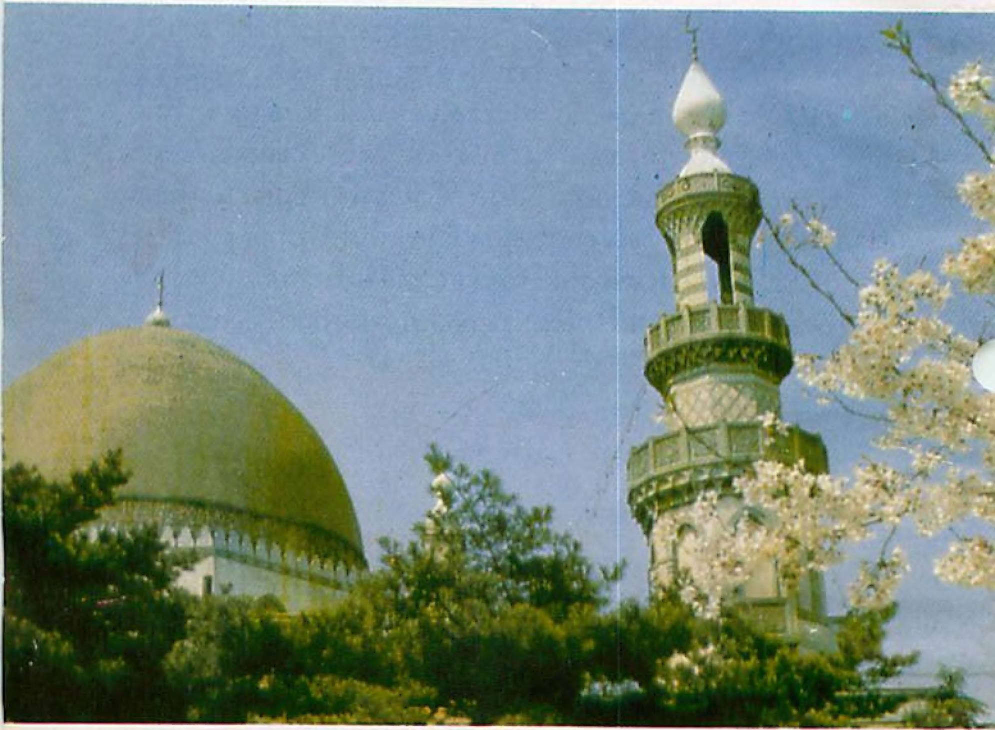
اپریل ۱۹۹۴ ، شمارہ ۲۰۹

الرسالہ
Al-Risala

زیر سرپرستی
مولانا وحیدالدین خان
صدر اسلامی مرکز



TOKYO MOSQUE, JAPAN (1938)

ہر نئی صبح یہ پیغام لے کر آتی ہے کہ کام کرنے کا
ایک اور قیمتی دن انسان کو دے دیا گیا

INDIAN MUSLIMS

The Need For A Positive Outlook

By Maulana Wahiduddin Khan

Man must run the gauntlet of adversity in this life, for that is in the very nature of things. But repeated emphasis on the darker side of life, with no mention of brighter prospects ahead can lead only to discouragement, depression and inertia. The better way to find solutions to the problems besetting us would be to seek out and lay stress on whatever opportunities present themselves, so that those upon whom fortune has not smiled may feel encouraged to take the initiative in improving themselves and their lot in life.

In the light of concrete realities, this book focuses, therefore, on how, in entering upon the more positive avenues open to them, Muslims may avail themselves of the same kind of opportunities right here in India as they would find at any other point on the globe. For them treading this path is treading the path of wisdom.

Price Rs. 175 (Hardbound)
Rs. 65 (Paperback)

ISBN 81-85063-80-X (HB)
ISBN 81-85063-81-8 (PB)

Published by
AL-RISALA BOOKS
1, Nizamuddin West Market, New Delhi 110013
Tel: 4611128 Fax: 91-11-4697333

Distributed by
UBS Publishers' Distributors Ltd.
5 Ansari Road, New Delhi 110002
Bombay Bangalore Madras Calcutta Patna Kanpur London

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ

اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہونے والا اسلامی مرکز کا ترجمان

اپریل ۱۹۹۴، شمارہ ۲۰۹

AL-RISALA BOOK CENTRE
1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110013
Tel : 4611128 Fax : 91-11-4697333
Single Copy Rs. 6 □ Annual Subscription Rs. 70/$25 (Air-mail)
Printed by Nice Printing Press, Delhi

قومیت کا مسئلہ

۱۹۹۲ کا سال میرا ملاقاتوں کا سال رہا ہے۔ اس دوران میں نے ملک کے مختلف حصوں کے سفر کیے۔ بہت سے اجتماعات میں شرکت کی۔ کثرت سے لوگوں سے ملاقاتیں کیں۔ میں نے پایا کہ بیشتر لوگ ملک کے مستقبل کے بارہ میں ناامید ہیں۔ مگر مجھے ایسے لوگوں سے اتفاق نہیں۔ اب بھی میں انڈیا کے مستقبل کے بارہ میں پوری طرح پُر امید ہوں۔

میرا عقیدہ ہے کہ ناامیدی فطرت کے نظام کے خلاف ہے۔ اور جو چیز فطرت کے نظام کے خلاف ہو وہ کبھی قابل لحاظ نہیں ہو سکتی۔ ہر آدمی جانتا ہے کہ ہماری دنیا میں ہر شام کے بعد صبح آتی ہے۔ یہ نظام اتنا زیادہ محکم ہے کہ اس کی پیشین گوئی کی جا سکتی ہے۔ حتیٰ کہ ایک فلکیات داں اس پوزیشن میں ہے کہ ہزار سال بعد آنے والی صبح کا وقت وہ آج ہی ٹھیک ٹھیک بتا سکے۔ پھر جس دنیا میں ہر ۲۴ گھنٹے کے اندر شام کے بعد صبح کا مظاہرہ کیا جا رہا ہے، کیسے ممکن ہے کہ وہاں ناامیدی کے اندھیرے کے بعد امید کا اجالا ظاہر نہ ہو۔

یہاں میں ایک مثال دوں گا۔ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو جب اجودھیا کی بابری مسجد ڈھائی گئی تو کئی اخباروں نے لکھا کہ اب مسجدوں کے انہدام کا وہ طویل سلسلہ شروع ہو گیا جس کے لیے عرصہ سے ۳۰۰ یا ۳۰۰۰ ہزار مسجدوں کی فہرست پیش کی جا رہی تھی۔ مگر میرا تاثر اس کے بالکل برعکس تھا۔ میں نے کہا کہ نہیں اب کوئی اور مسجد نہیں ٹوٹے گی۔ اب ہمارے ملک سے "اینٹی مسجد" سیاست ختم ہو گئی۔ لوگ ۶ دسمبر کو آغاز سمجھ رہے تھے۔ مگر میں نے کہا کہ نہیں، یہ اختتام ہے۔

اپنے اسی یقین کو ایک فارمولا کی صورت دیتے ہوئے میں نے کہا کہ "مسلمان ایک پر چُپ ہو جائیں اور ہندو ایک کے بعد پر چُپ ہو جائیں"۔ ابتدا میں بہت سے لوگوں کو یہ فارمولا عجیب معلوم ہوا تھا۔ مگر آج دیکھئے تو دونوں فرقے بلا اعلان اسی اصول پر قائم ہو چکے ہیں۔ ۶ دسمبر کے بعد مسلمان ایک مسجد پر چپ ہو چکے ہیں اور ہندو ایک کے بعد کی مسجدوں پر چپ ہو چکے ہیں۔ اگرچہ بظاہر دونوں طرف کے کچھ غیر اہم افراد کبھی کبھی سابقہ بولی بولتے ہوئے سنائی دیتے ہیں۔ مگر یہ بدترین قسم کی خلاف زمانہ حرکت (anachronism) ہے جو کبھی دیر تک چلنے والی نہیں۔

میرے اس یقین کی وجہ یہ تھی کہ اس دنیا میں ہر تخریب کا ایک خاتمہ (end) ہے۔ جب کوئی تخریبی تحریک اپنا آخری واقعہ کر ڈالے تو اس کے بعد خود اس کا بھی آخری وقت آجاتا ہے۔ انسانی تاریخ اس اصول کی تصدیق کرتی ہے۔

اسی طرح ایک مسئلہ اس تحریک کا ہے جس کو عام طور پر ثقافتی قومیت (culturalism nationalism) کے نام سے جانا جاتا ہے۔ بہت سے لوگ اس کو خطرہ سمجھتے ہیں۔ کیوں کہ یہ لوگ کہہ رہے ہیں کہ ہم ملک کے موجودہ کمپوزٹ کلچر (مشترک کلچر) کو بدل کر اس کو واحد انڈین کلچر کے روپ میں ڈھالیں گے۔ ان کا خیال ہے کہ اس طرح وہ ملک میں سماجی ایکتا پیدا کر سکتے ہیں۔

ملک کے سنجیدہ لوگ اس تحریک کو ملک کے لیے خطرہ سمجھتے ہیں۔ کیوں کہ کسی ملک کے موجودہ کلچرل ڈھانچہ کو بدل کر نئے ڈھانچہ کا کلچر بنانا ایک نیا جھگڑا پیدا کرنا ہے۔ اس سے سماجی ایکتا ٹوٹتی ہے۔ اس طرح کی کسی کوشش سے کبھی سماجی ایکتا آنے والی نہیں۔

مگر مجھے اس تحریک میں کوئی خطرہ دکھائی نہیں دیتا۔ کیوں کہ یہ وہ لوگ ہیں جو کہ فطرت سے لڑنا چاہتے ہیں اور فطرت سے لڑنے والے لوگ ہمیشہ ناکام رہتے ہیں۔ وہ اس دنیا میں کبھی اپنے نقشہ کو قائم کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔

جو لوگ ملک کے کمپوزٹ کلچر کو بدلنے کی بات کرتے ہیں ان کو معلوم نہیں کہ کلچر ہمیشہ کمپوزٹ ہی ہوتا ہے حتیٰ کہ خود وہ لوگ اگر بالفرض "انڈین کلچر" کے نام سے کوئی نیا کلچر رائج کر سکیں تو وہ بھی ایک کمپوزٹ کلچر ہی ہوگا۔ میں ان لوگوں سے کہتا ہوں کہ کسی ملک کا کلچر کبھی کسی دفتر میں یا کسی جلسہ گاہ میں نہیں بنتا وہ ہمیشہ لمبے سماجی عمل کے دوران بنتا ہے۔ کلچر ہمیشہ تاریخی پراسس کا نتیجہ ہوتا ہے نہ کہ کسی پولیٹکل رزولیوشن کا نتیجہ۔ میں کلچرل نیشنلزم یا یونی کلچرلزم کے نعرہ کو فطرت کے قوانین کے خلاف سمجھتا ہوں۔ اور جو چیز فطرت کے قانون کے خلاف ہو اس کو ظہور میں لانے پر نہ کوئی پاور قادر ہے اور نہ کوئی سپر پاور۔

مزید یہ کہ یونی کلچر کی بات تنگ نظری کی بات ہے اور ملٹی کلچر کی بات وسعت نظری کی بات۔ مجھے یقین نہیں کہ ہمارے ملک کے لوگ اتنے زیادہ نادان ہو سکتے ہیں کہ وہ وسعت نظری کے مقابلہ میں تنگ نظری کو ترجیح دیں۔

نئی دہلی کے کانسٹی ٹیوشن کلب میں ۲۴ جولائی ۱۹۹۳ کو ایک میٹنگ تھی۔ یہ میٹنگ ٹائمس آف انڈیا

کے سابق ایڈیٹر گری لال جین کی یاد میں بلائی گئی۔ موجودہ ایڈیٹر مسٹر دلیپ پیڈ گاؤنکر نے اس میں تقریر کرتے ہوئے جو بات کہی اس کو یہاں میں دہراؤں گا۔ انھوں نے کہا کہ کسی انسان کی آئیڈنٹٹی ہمیشہ کئی چیزوں سے مل کر بنتی ہے۔ اس کو آپ محدود روپ نہیں دے سکتے۔

انھوں نے کہا کہ میری آئیڈنٹٹی کا ایک پہلو یہ ہے کہ میں ایک خاص خاندان میں پیدا ہوا۔ دوسرا یہ کہ ایک خاص زبان میری مادری زبان بنی۔ میرے رہن سہن پر کچھ حالات کا اثر پڑا۔ میرے سماجی بیک گراونڈ سے میرا ایک مذہب بنا۔ میں باہر کے دیشوں میں گیا۔ اس نے بھی میرے اوپر کچھ اثرات ڈالے۔ اس قسم کی بہت سی چیزیں میری شخصیت کے اجزا ہیں۔ اور انسانی شخصیت اتنی وسیع ہے کہ وہ بیک وقت بہت سے متضاد چیزوں کا احاطہ کر سکتی ہے :

I am large enough to contain all these contradictions.

میں سمجھتا ہوں کہ یہ قول انڈیا کی اسپرٹ کو بلکہ وسیع تر معنی میں انسانیت کی اسپرٹ کو بتاتا ہے۔

کچھ لوگ یہ شکایت کرتے ہوئے ملتے ہیں کہ ۱۹۴۷ سے پہلے انڈیا کے لیڈروں نے یہ وعدہ کیا تھا کہ آزادی کے بعد "ہندستانی" ملک کی زبان ہوگی جو فارسی اور دیوناگری رسم الخط میں لکھی جائے گی۔ مگر آزادی کے بعد ہندی کو ملک کی سرکاری زبان بنا دیا گیا۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ یہ شکایت کچھ زیادہ وقیع نہیں۔

زبان مشترک کلچر کا اہم حصہ ہے۔ زبان کو کوئی بناتا نہیں۔ زبان تاریخی عمل کے دوران اپنے آپ بنتی ہے۔ انڈیا میں مسلمان آئے تو وہ عربی، فارسی زبان لے آئے۔ اس وقت دہلی اور اس کے آس پاس کے علاقہ میں ہریانی، پنجابی، کھڑی بولی، برج بھاشا، راجستھانی وغیرہ بولیاں رائج تھیں۔ ان بولیوں سے مسلمانوں کا میل جول بڑھا تو اس کے نتیجہ میں ایک ملی جلی زبان بننا شروع ہوئی۔ یہ زبان بعد کو ہندستانی کہلائی۔ یہ مشترک زبان ملکی اور غیر ملکی دونوں زبانوں کے الفاظ اور اسلوب کے ملنے سے بنی۔

یہ بیچ کی اور مشترک زبان آج بھی انڈیا کے بیشتر لوگوں کی زبان ہے۔ مسلمانوں کے لیے وہ گویا کہ آسان اردو ہے اور ہندو کے لیے وہ آسان ہندی۔ آج تمام بڑے بڑے ہندی اخبار جس زبان میں نکلتے ہیں وہ یہی ہندستانی زبان ہے جس کو دیوناگری رسم الخط میں لکھا جاتا ہے۔ اور جو انڈیا کے بیشتر لوگوں کے لیے آج بھی واحد قابل فہم زبان ہے۔

مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اس معاملہ کو شکایتی ذہن سے نہ لیں۔ بلکہ اسے وقت کا تقاضا سمجھ کر قبول کر لیں۔ وہ صرف یہ کریں کہ اردو رسم الخط کے ساتھ دیوناگری رسم الخط بھی سیکھ لیں جو ان کے لیے نہایت آسان ہے۔ اس کے بعد انھیں معلوم ہوگا کہ مروجہ ملکی زبان عین وہی مطلوب زبان ہے جس کو وہ ہندستانی کے نام سے جانتے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ کسی قوم کا یا انسانیت کا مستقبل کوئی شخص یا گروپ نہیں بناتا۔ قوم یا انسانیت کا مستقبل ہمیشہ تاریخ کی طاقتیں بناتی ہیں۔ اور انڈیا بلاشبہ اس معاملہ میں کوئی استثنائی کیس نہیں۔

قومی دھارا اور اقلیت

اقلیتیں اور قومی دھارا (Minorities in India and the national mainstream)

کا سوال لمبی مدت سے انڈیا کے فکری ایجنڈے پر ہے۔ ہمارے تمام سنجیدہ دماغ اس پر لکھتے اور بولتے رہے ہیں۔ مگر پچاس سالہ ڈیبیٹ کے باوجود اس اہم ترین سوال کے بارہ میں ابھی تک فکری اتفاق رائے بھی نہ ہو سکا۔ کجا کہ عملی اعتبار سے اس کی جانب کوئی حقیقی پیش رفت ہوئی ہو۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اس معاملہ میں ابھی تک ہم نقطۂ آغاز متعین کرنے میں بھی کامیاب نہ ہو سکے، جب کہ یہ حقیقت ہے کہ ملک کا مستقبل سب سے زیادہ اسی سوال کے صحیح جواب پر منحصر ہے۔ ایسی حالت میں ضرورت ہے کہ اس مسئلہ پر از سر نو مزید سنجیدگی کے ساتھ غور کیا جائے۔ اور کم از کم نظری سطح پر کسی قابل عمل اسکیم تک پہنچنے کی کوشش کی جائے۔ اگر ہم اس کی نظری بنیاد طے کرنے میں کامیاب ہو سکیں تو یہ ہمارے لیے پچاس فی صد کامیابی کے ہم معنی ہوگا۔ اور اس پر یہ مقولہ صادق آئے گا کہ بہتر آغاز کا مطلب یہ ہے کہ آدھا کام ہو گیا:

Well begun is half done.

یہ ایک حقیقت ہے کہ اس ملک میں اقلیت اور اکثریت کے اختلافات نہایت شدت کے ساتھ موجود ہیں۔ اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان اختلافات کے نتیجہ میں جو باہمی ٹکراؤ پیش آیا ہے اس سے ملک کو غیر معمولی نقصان پہنچا ہے۔ جب تک اس مسئلہ کا کوئی مناسب حل تلاش نہ کیا جائے ملک کو ترقی کی طرف لے جانا ممکن نہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ اکثریتی فرقہ اور اقلیتی فرقہ کے درمیان پر امن تعلقات قائم کرنے کے لیے کون سا طریقہ اختیار کیا جائے۔ اور اس کا ماڈل کیا ہو۔ جہاں تک میرا خیال ہے، اس معاملہ میں غور و فکر کے لیے ہمارے سامنے بنیادی طور پر دو ماڈل ہیں۔ ایک ماڈل وہ جس میں تجویز کیا گیا ہے کہ دونوں فرقے اختلافات کو نظر انداز کرتے ہوئے باہم مل جل کر رہنے کا طریقہ اختیار کریں۔ دوسرا ماڈل وہ جو اس نظریہ پر مبنی ہے کہ تمام اختلافات کو مٹا کر سب کو ایک بھارتی

نمونہ پر ڈھال دیا جائے۔ ان میں سے اول الذکر کو میں ملٹی کلچر ماڈل کہوں گا اور ثانی الذکر کو یونی کلچر ماڈل۔

انڈیا کے ابتدائی معماروں نے اس معاملہ میں جو ماڈل پیش کیا وہ وہی تھا جس کو میں نے ملٹی کلچر ماڈل کا نام دیا ہے۔ یہ ماڈل بقار باہم (co-existence) کے اصول پر مبنی تھا۔ یعنی ملک کے مختلف گروپ اپنے کلچرل تشخص کو باقی رکھتے ہوئے وسیع تر ملکی مفاد کی سطح پر ایک قوم بن جائیں۔

یہاں میں یہ کہنے کی اجازت چاہوں گا کہ اس ماڈل کو واقعہ بنانے کے لیے اس پولیٹکل گروپ کو ایک قیمت ادا کرنا تھا جس کو آزادی کے بعد ملک میں حکومت کرنے کا موقع ملا۔ بدقسمتی سے رولنگ گروپ یہ قیمت ادا کرنے میں ناکام رہا۔ اس لیے یہ ماڈل، اپنی اصولی صحت کے باوجود، کامیاب نہ ہو سکا۔

وہ قیمت کیا تھی، وہ قیمت ایک لفظ میں تھی، فری اینڈ فیر الکشن۔ آزادی (۱۹۴۷) کے بعد کسی بھی تعمیری کام کے لیے ملک میں یہ ماحول قائم کرنا ضروری تھا کہ یہاں کا ہر سیاسی گروہ یہ محسوس کرے کہ اقتدار کا دروازہ اس کے لیے کھلا ہوا ہے اور پر امن جمہوری ذرائع کو استعمال کر کے وہ وہاں تک پہنچ سکتا ہے۔ مگر رولنگ گروپ ایک بار اقتدار میں آنے کے بعد اس کا حریص ہو گیا کہ اس کا اقتدار ہمیشہ ملک میں باقی رہے۔

کوئی رولنگ گروپ جب ایسا چاہنے لگے تو اس کے بعد یہ ہوتا ہے کہ غیر رولنگ طبقات کو دکھائی دینے لگتا ہے کہ امن اور آئین کے حدود میں رہ کر اقتدار تک پہنچنا ان کے لیے ممکن نہیں ہے۔ اب چونکہ جمہوری دور میں کوئی بھی شخص اپنی سیاسی محرومی پر راضی نہیں ہو سکتا، اس لیے اس صورت حال کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سماج میں تخریبی سیاست کا ذہن پرورش پانے لگتا ہے۔

آزادی کے بعد انڈیا میں یہی ہوا۔ رولنگ گروپ کے باہر جو پولیٹکل عناصر تھے، انھوں نے محسوس کیا کہ امن اور قانون کے حدود کی پابندی کرتے ہوئے وہ اقتدار تک نہیں پہنچ سکتے۔ اس لیے انھوں نے غیر آئینی طریقہ پر اقتدار تک پہنچنے کا فیصلہ کیا۔ انڈیا جیسے نیم خواندہ ملک میں ان کے لیے اس مقصد کے حصول کا سب سے زیادہ آسان ذریعہ جذباتی سیاست تھا۔ چنانچہ انھوں نے خاص طور پر ۱۹۸۵ کے بعد نہایت شدت کے ساتھ "مندر۔مسجد" کے اشو کو

بھڑکایا۔ اس کے نتیجہ میں جو کچھ ہوا وہ اب تاریخ کا ایک حصہ بن چکا ہے۔

اس دوسری سیاست کے فروغ ہی کا یہ نتیجہ تھا کہ ملک میں ملٹی کلچر کا ماڈل دب گیا اور اس کے بجائے ایک اور ماڈل ابھر کر سامنے آگیا۔ اس دوسرے ماڈل کو ایک لفظ میں یونی کلچر ماڈل کہا جاسکتا ہے۔ ملک کے باشعور طبقہ میں یہ دوسرا ماڈل اگرچہ کافی کنٹرو ورشیل رہا ہے۔ تاہم عوام کی سطح پر، خاص طور پر شمالی ہند میں، یونی کلچر ماڈل کی مقبولیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

جمہوری نظام میں، خالص اصول کی بنیاد پر کسی کو اس سے روکا نہیں جاسکتا کہ وہ یونی کلچر ماڈل کی بات کرے۔ مگر مجھے یقین ہے کہ عملی طور پر یہ ماڈل قابل عمل (feasible) نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ نیچر کے خلاف ہے۔ وہ نیچرل لا کو بدلنے کے ہم معنی ہے، اور کوئی بھی طاقت نیچر کو بدلنے پر قادر نہیں ہو سکتی۔

تعدد (diversity) زندگی کا ایک ابدی قانون ہے۔ ایک گھر میں دس آدمی ہوں تو ہر آدمی کا مزاج الگ الگ ہوگا۔ ہر ایک کی پسند اور ناپسند جدا ہو گی۔ یہی معاملہ زیادہ بڑے پیمانہ پر قوم کا ہے۔ قوم کے مختلف گروپ عین فطرت کے قانون کی بنا پر الگ الگ ذہن کے ہوتے ہیں۔ پھر کون انھیں بدل سکتا ہے۔ نیچر کو بلڈوز کرنا کسی بھی پاور یا سپر پاور کے لیے ممکن نہیں۔

جو لوگ "یونی کلچر" کے حامی ہیں، وہ خود بھی اس معاملہ میں تضاد فکری کا شکار ہیں۔ مثلاً ان کا کہنا ہے کہ اورنگ زیب نے اپنے پچاس سالہ دور حکومت میں انڈیا میں یکساں کلچر پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اسی طرح برٹش ایمپائر کو اس ملک میں سو سال سے زیادہ مدت تک حکومت کرنے کا موقع ملا۔ انھوں نے بھی ملک میں یکساں کلچر لانے کے لیے اپنی ساری کوشش صرف کر دی۔ مگر ہم جانتے ہیں کہ دونوں میں سے کوئی بھی اس مقصد میں کامیاب نہیں ہوا کہ وہ پورے ملک کو ایک کلچرل رنگ میں رنگ دے۔

باہر کی دنیا میں بھی اس نوعیت کی تجرباتی مثالیں موجود ہیں۔ مثلاً دوسری عالمی جنگ کے بعد امریکہ میں امریکنائزیشن کی تحریک چلائی گئی۔ اس کا مقصد امریکہ میں بسنے والے مختلف کلچرل گروپ کو ایک امریکی کلچر میں رنگنا تھا۔ مگر یونی کلچرلزم کی یہ تحریک ساری کوشش کے باوجود امریکہ

میں فیل ہوگئی۔ آخر کار انھوں نے حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے ملٹی کلچرلزم کے اصول کو اختیار کر لیا۔

ایسی حالت میں انڈیا کے یونی کلچرسٹوں کے پاس وہ کون سی خصوصی طاقت ہے جس کی بنا پر وہ یقین رکھتے ہیں کہ نیچر سے لڑائی کے جس میدان میں دوسرے تمام لوگ ناکام ہو چکے ہیں، اس میں وہ استثنائی طور پر کامیابی حاصل کر لیں گے۔

مزید یہ کہ یونی کلچرلزم کا یہ نظریہ اصل مقصد کے لحاظ سے بالکل بے فائدہ ہے۔ کیوں کہ ہمارا مقصد یونی کلچر برائے یونی کلچر نہیں ہے، بلکہ اس کا مقصد سوشل ہارمنی یا نیشنل ہارمنی کا ماحول پیدا کرنا ہے، اور اس مقصد کا کوئی تعلق یونی کلچر سے نہیں۔

اس کی ایک قریبی مثال ہندو اور سکھ کا معاملہ ہے۔ سکھ عملی طور پر ہندوازم ہی کا ایک حصہ تھے۔ چنانچہ پچھلے ساڑھے چار سو سال سے دونوں کا کلچر ہر اعتبار سے تقریباً ایک تھا۔ اس کے باوجود دونوں میں زبردست اختلاف برپا ہوا جو ابھی تک دونوں کے درمیان خونیں ٹکراؤ کی صورت میں جاری ہے۔ یونی کلچر اگر ہارمنی لانے کے لیے کافی ہوتا تو ہندو۔ سکھ مسئلہ کبھی اس ملک میں پیدا نہ ہوتا۔

ایسی حالت میں ملک کے مختلف طبقات میں ہم آہنگی (ہارمنی) لانے کا واحد ممکن طریقہ یہ ہے کہ اس متفقہ اخلاقی اصول کو اختیار کر لیا جائے جس کو مغرب میں اختلاف پر اتفاق (let us agree to disagree) کا اصول کہا جاتا ہے اور انڈیا میں بقاء باہم (co-existence) ہے۔ اس کے مطابق، اس مسئلہ کا حل یہ ہے کہ لوگوں کے اندر یہ مزاج پیدا کیا جائے کہ وہ اختلاف کے باوجود مل کر رہنے کا آرٹ سیکھیں۔ وہ ایک دوسرے کا احترام (respect) کریں۔ وہ اختلافی پہلوؤں کو نظر انداز کریں اور صرف اتفاقی پہلوؤں پر زور دیں۔

یہ ایک طریق زندگی (way of life) ہے۔ اور ٹالرنس اسی طریق زندگی کا عنوان ہے۔ ٹالرنس ہی واحد بنیاد ہے جس پر کسی سماج میں ہارمنی لائی جا سکتی ہے۔ اس کے سوا جو نظریے پیش کیے جاتے ہیں وہ صرف خوب صورت الفاظ ہیں جو کبھی عمل میں آنے والے نہیں۔

انڈیا میں ایک بڑا سبق آموز ظاہرہ موجود ہے جس پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ وہ یہ کہ

سکھ اقلیت اگرچہ مجارٹی کمیونٹی کے کلچرل مین اسٹریم میں پوری طرح شامل تھی۔ اس کے باوجود سکھ اور ہندو کے درمیان خونیں ٹکراؤ پیش آیا۔ دوسری طرف اسی ملک میں کرسچین اور پارسی ہیں۔ وہ واضح طور پر اپنا علاحدہ کلچر رکھتے ہیں۔ مگر ان میں اور مجارٹی کمیونٹی میں کوئی ٹکراؤ نہیں۔

انڈیا میں کرسچین کی تعداد تقریباً ۳ فی صد ہے۔ پارسی اگرچہ بہت کم ،یعنی مجموعی طور پر صرف ایک لاکھ ہیں۔ تاہم اپنی بعض خصوصیات کی بنا پر وہ ملک میں ایک قابل لحاظ کمیونٹی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ کرسچین اور پارسی دونوں مذہبی اعتبار سے بند سماج (close society) ہیں۔ ان کا کیس کلچرل یکسانیت کا کیس نہیں بلکہ کلچرل انفرادیت کا کیس ہے۔ اس کے باوجود وہ نیشنل مین اسٹریم سے الگ نہیں سمجھے جاتے۔

اس سوال کا جواب معلوم کرنے پر غور کیجئے تو ایک اہم حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ کوئی گروپ خواہ جو عقیدہ بھی رکھے اور اپنے دائرہ میں جس طرح بھی رہے، اگر وہ دوسروں کے لیے نو پرابلم گروپ بنا ہوا ہو تو اس کے اور دوسروں کے درمیان کبھی ٹکراؤ نہیں ہوگا۔

کرسچین کمیونٹی کا معاملہ کیا ہے۔ انھوں نے اپنے آپ کو بہت بڑے پیمانہ پر تعلیم گاہ، اسپتال اور دوسرے رفاہی کاموں میں لگا دیا ہے۔ وہ دوسروں سے ٹکراؤ کو آخری حد تک اوائڈ کرتے ہوئے اپنے اختیار کردہ دائرہ میں مصروف رہتے ہیں۔ یہی حال پارسی کمیونٹی کا ہے۔ انھوں نے اپنے آپ کو مکمل طور پر صنعت اور تجارت کے دائرہ میں سمیٹ لیا ہے۔ ملک کے دوسرے طبقات سے ان کی نہ کوئی مانگ ہے اور نہ کوئی احتجاج۔

اس بات کو دوسرے لفظوں میں ، اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ کرسچین اور پارسی دونوں اس ملک میں اپنے آپ کو "نو پرابلم کمیونٹی" بنائے ہوئے ہیں۔ اور یہ تاریخ کا تجربہ ہے کہ جو گروپ کسی سماج میں نو پرابلم گروپ بن کر رہے وہ اپنے آپ دوسروں کے لیے قابل قبول بن جاتا ہے۔

اب مسلم کمیونٹی کو لیجئے۔ اس وقت اصلاً سب سے بڑا مسئلہ مسلم مائنارٹی ہی کا ہے۔ کیونکہ ملک کی سب سے بڑی مائنارٹی ہونے کی بنا پر وہ نکسٹ ٹو مجارٹی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور یہ

ایک تاریخی حقیقت ہے کہ خواہ گروپ کا مسئلہ ہو یا فرد کا، مسٹر فرسٹ اور مسٹر نکسٹ کے درمیان ہمیشہ کچھ نہ کچھ رقابت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کا واحد قابل عمل حل صرف ایک ہے۔ وہ یہ کہ مسٹر نکسٹ مسٹر نوپرابلم بن جائے۔

مسلم کمیونٹی اور مجاریٹی کمیونٹی کے درمیان پچھلے تقریباً ۵۰ سال سے مسلسل کش مکش جاری ہے۔ اس کش مکش نے مختلف صورتوں میں ملک کو غیر معمولی نقصان پہنچایا ہے۔ گہرائی کے ساتھ غور کیجئے تو اس کا سبب صرف ایک ملے گا، اور وہ ہے ——— مسلم کمیونٹی کا پرابلم کمیونٹی کی صورت اختیار کر لینا۔

اس معاملہ کو مزید گہرائی کے ساتھ دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ ہندو۔مسلم مسئلہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے عین وہی ہے جو ہندو۔سکھ مسئلہ ہے۔ ہندو اور سکھ اس ملک میں پچھلے ساڑھے چار سو سال سے مل جل کر رہ رہے تھے۔ دونوں کے درمیان کوئی جھگڑا نہیں تھا۔ مگر ۲۰ سال پہلے سکھوں نے علاحدہ سکھ اسٹیٹ کی تحریک اٹھائی اور پھر اس کو وہ تشدد کی حد تک لے گئے۔ اس کے بعد دونوں فرقوں کے درمیان جھگڑا پیدا ہوا۔

اس فرق کی وجہ سادہ طور پر صرف یہ تھی کہ خالصتان تحریک سے پہلے سکھ کمیونٹی اس ملک میں گویا نوپرابلم کمیونٹی کی حیثیت رکھتی تھی۔ اس پر تشدد تحریک کے بعد وہ ایک پرابلم کمیونٹی بن گئی۔ اور پرابلم گروپ ایک گھر کے اندر بھی برداشت نہیں کیا جاتا، پھر وہ پورے ملک میں کیسے برداشت کیا جا سکتا ہے۔

ٹھیک یہی معاملہ مسلمانوں کے ساتھ بھی پیش آیا۔ یہ ایک واقعہ ہے کہ مسلم لیڈروں کی تقسیم ملک کی تحریک جو اربعینات میں شدت کے ساتھ اٹھی، اس سے پہلے اس ملک میں ہندو اور مسلمان پوری طرح مل جل کر رہتے تھے۔ دونوں میں فرقہ وارانہ سطح پر کوئی قابل ذکر کش مکش موجود نہ تھی۔ لیکن پر شور دو قومی تحریک اور اس کے بعد ۱۹۴۷ میں ملک کے بٹوارہ نے اس ملک کے مسلمانوں کو اہل ملک کی نظر میں ایک پرابلم کمیونٹی بنا دیا۔ یہی واحد سبب ہے جس کے نتیجہ میں ہندو اور مسلمان کا وہ مسئلہ انڈیا میں پیدا ہوا جس کے کڑوے نتائج ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔

اوپر کے تجزیہ سے واضح ہوتا ہے کہ انڈیا کے مختلف فرقوں میں ہم آہنگی لانے کے لیے

ملٹی کلچر ماڈل ہی واحد درست ماڈل ہے۔ کامیابی کے امکانات بھی صرف اسی کے لیے ہیں۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ فطرت کی موافقت صرف اسی کے ساتھ ہے۔ تاہم اس کی کامیابی کی ایک لازمی شرط ہے۔ اور وہ یہ کہ مائناریٹی کمیونٹی اس کے قیام کے لیے اپنا ضروری تعاون دے۔ اور اس کا تعاون یہ ہے کہ وہ ملک میں نو پرابلم کمیونٹی بن کر رہنے لگے۔ اگر یہ شرط پوری ہو جائے تو اس کے بعد کوئی بھی چیز ملک میں ہارمنی کا ماحول پیدا کرنے میں رکاوٹ نہیں بن سکتی۔

مسلمان اگر اس ملک میں نو پرابلم کمیونٹی بن کر رہنے پر راضی ہو جائیں تو یہ ان کے لیے اپنے مذہب سے انحراف نہیں ہوگا بلکہ عین اپنے مذہب پر عمل کرنا ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کے لیے پرابلم کمیونٹی بننا اپنے مذہب سے انحراف تھا، اور نو پرابلم کمیونٹی بننا ان کے لیے اپنے مذہب کی طرف واپسی کے ہم معنی ہوگا۔ یہاں اس سلسلہ میں بطور مثال اسلام کے چند متعلق (relevant) حوالے پیش کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابو طالب مکہ میں آپ کے حامی تھے۔ ان کے انتقال کے بعد آپ کو نئے حامی کی ضرورت تھی جس کی حمایت کے تحت آپ نبوت و رسالت کا کام جاری رکھیں آپ مختلف عرب قبائل کے پاس گئے اور ان سے کہا کہ مجھے اپنی حمایت میں لے لو۔ اس سلسلہ میں جو تفصیلات سیرت کی کتابوں میں آئی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ آپ ایک قبیلہ سے ملے۔ اس سے جب آپ نے اپنی ضرورت بیان کی تو اسی کے ساتھ یہ بھی کہا کہ میں صرف اعلان رسالت کا کام کروں گا۔ اور تم میں سے کسی شخص کو کسی ناپسندیدہ چیز پر مجبور نہیں کروں گا (ولا اکرہ احداً منکم علی شیئ)

اس بات کو اگر لفظ بدل کر کہا جائے تو وہ یہی ہوگی کہ میں تمہارے لیے کوئی پرابلم نہیں پیدا کروں گا۔ میں تمہارے درمیان ایک نو پرابلم انسان بن کر رہوں گا۔

قدیم مکہ میں کعبہ کے اندر ۳۶۰ بت رکھے ہوئے تھے۔ مگر قرآن میں پہلی آیت اتری تو اس میں کعبہ کے بتوں کے مسئلہ کا کوئی حوالہ موجود نہ تھا۔ پہلا حکم جو قرآن میں دیا گیا وہ یہ تھا کہ اقرأ (پڑھ) اس کا مطلب یہ ہے کہ دور اول میں تطہیر مسجد کو اشو بنانے کے بجائے حصول علم کو اشو بنایا گیا۔ اس کے مطابق، موجودہ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ مسجد کی "بے حرمتی" کو اپنا اشو نہ بنائیں،

بلکہ ایجوکیشن کو اپنا اشو بنائیں۔

پیغمبر اسلام کے زمانہ میں مکہ کے لوگ بت پرست تھے۔ مگر پیغمبر نے ان کو بت پرست یا کافر کے لفظ سے خطاب نہیں کیا۔ بلکہ یہ کہا کہ اے میری قوم۔ اس سنت رسول کے مطابق مسلمانوں کو بھی انڈیا کے ہندوؤں کو اپنی قوم سمجھنا چاہیے اور ان کے ساتھ بھائی جیسا معاملہ کرنا چاہیے۔

پیغمبر اسلام نے راستہ سے رکاوٹ ہٹانے کو ایمان کی علامت بتایا ہے (اماطۃ الاذی عن الطریق) ایسی حالت میں مسلمانوں کو اس پر احتجاج کرنے کی کیا ضرورت کہ شہر کی مصروف سڑک پر نماز پڑھنے سے انھیں منع کیا جاتا ہے۔ کیوں کہ یہ تو وہی چیز ہے جس کی تعلیم اسلام میں بہت پہلے سے موجود ہے۔

خلیفہ ثانی عمر فاروق ؓ کے زمانہ میں فلسطین فتح ہوا تو انھوں نے باقاعدہ تحریر کی صورت میں وہاں کے مسیحیوں کو یہ اجازت دی کہ وہ یروشلم کی مسجد کے سامنے سے اپنا جلوس نکالیں۔ پھر ہندستان کے ہندو اگر یہاں کسی مسجد کے سامنے سے اپنا جلوس لے کر گزریں تو اس پر مسلمان کیوں اعتراض کریں اور کیوں ان کا جلوس روکنے کی کوشش کریں۔

پاکستان ایک اسلامی جمہوریہ کہا جاتا ہے۔ وہاں حکومت کی طرف سے فیملی پلاننگ کی اسکیم چلائی جارہی ہے۔ پاکستانی اخباروں میں مسلسل "خاندانی منصوبہ بندی" کے اشتہارات حکومت کی طرف سے چھپتے رہتے ہیں۔ وہاں محکمۂ ڈاک کی طرف سے ایسے لفافے چھاپے گئے ہیں جن کے اوپر لکھا ہوا ہوتا ہے: "چھوٹا خاندان زندگی آسان"۔ پھر انڈیا میں حکومت اگر اس قسم کی تحریک چلائے تو مسلمانوں کو اسے خطرہ سمجھنے اور اس پر ہنگامہ کرنے کی کیا ضرورت۔

سعودی عرب میں اور دوسرے اسلامی ملکوں میں استثنائی حالت میں مسجدیں ری لوکیٹ کی گئی ہیں۔ ایسی حالت میں انڈیا میں اگر استثنائی طور پر یا اضطرار کے حالات میں دفع شر کے لیے ایسا کوئی واقعہ ہو تو یہاں کے مسلمان اس کو اپنے لیے خطرہ کیوں سمجھیں۔

عرب ملکوں میں مسجدوں کے اندر جلسہ اور تقریر کی اجازت نہیں۔ حتی کہ نماز کے مخصوص اوقات کے علاوہ مسجد میں عبادت اور تلاوت کی بھی اجازت نہیں۔ ایسی حالت میں اگر انڈیا میں ہندو محلہ میں واقع مسجدوں میں رات کے وقت لاوڈ اسپیکر کے استعمال پر پابندی لگائی

جائے تو اس پر انھیں شور و غوغا کرنے کی کیا ضرورت۔

اسلام امن کو پسند کرتا ہے نہ کہ ٹکراؤ کو۔ حدیبیہ کے معاہدہ میں پیغمبر اسلام نے اپنے حریف کی تمام شرطوں کو یک طرفہ طور پر مان کر ان کے ساتھ پیس ایگریمنٹ کر لیا۔ اب مسلمانوں کو بھی اپنے پیغمبر کی پیروی میں یہی کرنا ہے کہ وہ مسائل کو نظر انداز کریں۔ وہ دوسروں کے ساتھ ہم آہنگی کا طریقہ اختیار کریں۔ وہ امن کو سپریم بنائیں نہ کہ ملی وقار کو۔ مسلمان اگر ایسا کریں تو انڈیا میں وہ نو پرابلم کمیونٹی بن جائیں گے۔ اور اس کے بعد موجودہ غیر ضروری مسائل بھی اپنے آپ ختم ہو جائیں گے۔

اس سلسلہ میں ایک چشم کشا مثال (telling example) ہے جو یہاں قابل ذکر ہے۔ دہلی کے انگریزی روزنامہ ہندستان ٹائمس (۱۴ اکتوبر ۱۹۹۳) نے اے این آئی (ANI) کے حوالہ سے بتایا ہے کہ پاکستان دنیا میں سب سے زیادہ غیر محفوظ ملک ہے۔ یہ بات ایک حالیہ جائزہ سے معلوم ہوئی ہے۔ یہ جائزہ بڑے بڑے تاجروں کے درمیان کرایا گیا ہے جن کا تعلق تمام براعظموں سے ہے۔ مختلف ملکوں کے بڑے بڑے تاجروں اور صنعت کاروں سے عالمی اقتصادی فورم نے یہ پوچھا تھا کہ وہ اپنے خیال کے مطابق مختلف ملکوں کے بارہ میں بتائیں کہ کس ملک میں جان اور مال کے تحفظ کے اعتبار سے کیا حالت ہے۔ اس جائزہ میں پاکستان کا مقام سب سے نیچے تھا جب کہ سنگاپور کو سب سے زیادہ محفوظ علاقہ پایا گیا :

Pakistan happens to be the unsafest country in the world, according to a recent survey conducted among the business and economic leaders belonging to all the continents. The leaders of the business and industry of various countries were asked by the World Economic Forum to rate various countries according to their perceptions about the safety of life and property in those countries. Pakistan touched the bottom whereas Singapore was found to be the safest place.

جیسا کہ معلوم ہے، پاکستان ایک قوم کے نعرہ پر بنا، وہاں تمام باشندوں کا ایک مذہب اور ایک زبان ہے۔ سب کی ایک تاریخ ہے اور سب کا ایک پر وج ہے۔ گویا سارے ملک کا ایک پاکستانی کلچر ہے۔ اس کے باوجود وہاں اتنے زیادہ دنگے اور فساد ہوتے ہیں کہ ساری دنیا میں وہ سب سے زیادہ غیر محفوظ ملک بن گیا ہے۔

دوسری طرف سنگاپور میں چار سرکاری زبانیں ہیں —— چینی، مالے، ٹمل، انگلش۔ وہاں

بدھسٹ، مسلم، ہندو، کرسچین سب اپنے اپنے مذہب اور کلچر کے ساتھ رہتے ہیں۔ ان سب کے باوجود سنگاپور دنیا کا سب سے زیادہ محفوظ ملک ہے۔ یہ تجربہ بتاتا ہے کہ قومی ایکتا کا کچھ بھی تعلق کلچرل ایکتا سے نہیں۔

خلاصہ

انڈیا کی اقلیتوں کو مین اسٹریم میں لانے کے لیے، دوسرے لفظوں میں یہ کہ ملک میں کمیونل ہارمنی پیدا کرنے کی واحد صورت یہ ہے کہ یہاں ملٹی کلچر ماڈل کو اختیار کر لیا جائے۔ اس ماڈل کو عملی طور پر قائم کرنے کے لیے ہر فریق کو ایک قیمت ادا کرنا ہے۔

رولنگ گروپ کو یہ قیمت ادا کرنا ہے کہ وہ الکشن پراسس کو فری اور فیر صورت میں جاری رکھے۔ ہارنے والی پارٹی اپنی ہار کو مان کر جیتنے والے گروپ کو گورنمنٹ چلانے کا موقع دے، تاکہ ملک میں تخریبی سیاست کی پرورش نہ ہو سکے۔

مجاریٹی کمیونٹی کو یہ قیمت ادا کرنا ہے کہ وہ اس حقیقت کو تسلیم کرے کہ یونی کلچر کا ماڈل قابل عمل نہیں۔ قابل عمل ماڈل وہی ہے جو ملٹی کلچر کے اصول پر مبنی ہے۔ یہی ممکن بھی ہے اور یہی مفید بھی۔

مائناریٹی کمیونٹی، خاص طور پر سکھ اور مسلمان کو یہ طے کرنا ہے کہ وہ اپنے مفاد کے لیے اور ملک کے وسیع تر مفاد کے لیے ہم آہنگی کے طریقہ کو اختیار کریں گے اور شعوری طور پر یہ فیصلہ کریں گے کہ اس ملک میں انھیں نو پرابلم کمیونٹی بن کر رہنا ہے۔

اگر ملٹی کلچر ماڈل کو سنجیدہ طور پر قبول کر لیا جائے، اور ہر متعلقہ فریق اس کے لیے ضروری قیمت بھی ادا کرے تو اس کے بعد بلا تاخیر ملک میں امن اور ہم آہنگی کا ماحول قائم ہو جائے گا اور ملک تیزی کے ساتھ ترقی کی طرف اپنا سفر شروع کر دے گا۔ اور جب ایک بار صحیح سمت میں سفر شروع ہو جائے تو وہ ضرور اپنی مطلوب منزل پر پہنچ کر رہتا ہے۔

ہندتو کے بارہ میں

خطرے دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک حقیقی خطرہ، اور دوسرا فرضی خطرہ۔ اگر حقیقی خطرہ درپیش ہو تو اس کا حل یہ ہے کہ آدمی اس کی نوعیت کو سمجھے اور اس کے مطابق بچاؤ کی ضروری تدبیر کرے۔ لیکن اگر خطرہ محض فرضی ہو تو مسئلہ بالکل بدل جاتا ہے۔ اب اس سے بچاؤ کی تدبیر صرف یہ ہوتی ہے کہ اس کو سادہ طور پر نظر انداز کر دیا جائے۔ فرضی خطرہ کو نظر انداز کر دینا ہی اس سے بچاؤ کی سب سے زیادہ کامیاب تدبیر ہے۔

ہندتو کا خطرہ راقم الحروف کے نزدیک محض فرضی خطرہ ہے، وہ کبھی واقعہ بننے والا نہیں۔ ایسی حالت میں اس کے لیے پریشان ہونے کی کیا ضرورت۔

یہ صحیح ہے کہ آج کل ہندتو کا کافی چرچا ہے۔ کچھ لوگ یہ کہنے لگے ہیں کہ مستقبل کا انڈیا ہندتو کی بنیاد پر تشکیل دیا جائے گا۔ مگر جہاں تک میرا مطالعہ ہے، خود ہندتو کے علم برداروں کے ذہن میں اس کا کوئی واضح نقشہ موجود نہیں ہے۔ اور جس چیز کا نقشہ ہی اب تک واضح طور پر متعین نہ ہوا ہو، وہ انڈیا کے مستقبل کی تشکیل کرنے والا کس طرح بنے گا۔

مسٹر لال کرشن آڈوانی کے الفاظ میں، ہندتو سے مراد کلچرل نیشنلزم (cultural nationalism) ہے۔ یعنی کلچر پر مبنی قومیت۔ وہ کون سا کلچر ہوگا جس پر یہ قومیت تشکیل دی جائے گی۔ اس کا جواب مسٹر جے دوباشی کے الفاظ میں یہ ہے کہ انڈیا میں قومی تشخص صرف ہندو ہی ہو سکتا ہے:

In India, the national identity can only be Hindu. (The Illustrated Weekly of India, March 12, 1993)

اسی کے ساتھ مسٹر گری لال جین کے الفاظ ملا لیجئے تو بات مکمل ہو جائے گی۔ ٹائمس آف انڈیا (۱۱ مارچ ۱۹۹۴) میں خاص اسی موضوع پر مسٹر جین کا ایک مضمون چھپا ہے۔ اس کا عنوان ہے:

Apartheid in reverse — Dangers of minorityism

مضمون نگار کے نزدیک انڈیا کے مسلمانوں کے مسئلہ کا حل یہ ہے کہ وہ اکثریتی فرقہ کے کلچر کو اختیار کر لیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ انڈیا کوئی انسانی چڑیا خانہ نہیں ہے جس میں مختلف انسانی انواع

ایک مقام پر الگ الگ خانوں میں رکھ دی گئی ہوں اور ان کو ایک نہ کیا جا سکتا ہو۔ انڈیا ممتاز طور پر اور ہزاروں سال سے ایک یکساں کلچر کا ملک ہے اگرچہ وہ یک سنگی نہیں :

India is not a human zoo with different species of humanity put together in one physical location in separate enclosures and it cannot be turned into one. It embodies a remarkably homogenous, though not monolithic, culture going back thousands of years. (p.8)

غیر ہندو فرقے اگر ہندتو کے علم برداروں کے اس مطالبہ کو بلا بحث مان لیں تب بھی اصل مسئلہ ختم نہیں ہوتا۔ کیوں کہ یکساں کلچر کو اختیار کرنے کے لیے اس کا ایک ماڈل ہونا ضروری ہے۔ حالاں کہ ایسا کوئی ماڈل سرے سے ملک کے اندر موجود ہی نہیں۔ اور جب ماڈل موجود نہ ہو تو اس کی پیروی کس طرح کی جائے گی۔

وہ چیز جس کو یہ حضرات ہندو کلچر یا بھارتی کلچر کہتے ہیں، وہ بروقت کسی ایک چیز کا نام نہیں ہے۔ اس میں بیک وقت بے شمار خدا ہے۔ بابری مسجد کو ڈھانے والے بھارتی کلچر کے نمائندوں نے پرفخر طور پر اجودھیا میں یہ نعرہ لگایا تھا کہ : ایک طرف ۳۳ کرور، ایک طرف ایک اللہ۔ اسی طرح ہندوؤں میں زبان، کھانا، کپڑا، رہن سہن، ہر چیز میں اختلاف ہے۔ حتی کہ ایک ہندو مبصر کے الفاظ میں، اس ملک میں جتنے ہندو ہیں، اتنی ہی ان کی قسمیں ہیں۔

جب ہندو کی اتنی زیادہ قسمیں ہیں تو سوال یہ ہے کہ وہ کون ہندو ہے جس کو پیروی کے لیے ماڈل سمجھا جائے۔ کیا وہ ہندو جو کوٹ اور پتلون پہنتا ہے یا وہ ہندو جو دھوتی اور کرتا پہنتا ہے۔ وہ ہندو جو مورتی پوجا کرتا ہے یا وہ ہندو جو مورتی پوجا کا کھنڈن کرتا ہے۔ وہ ہندو جو آستک ہے یا وہ ہندو جو ناستک ہے۔ وہ ہندو جو رامائن اور مہابھارت کو تاریخ کہتا ہے یا وہ ہندو جو رامائن اور مہابھارت کو افسانہ (متھ) سمجھتا ہے۔ وہ ہندو جو شاکاہاری ہے یا وہ ہندو جو منساہاری ہے۔ وہ ہندو جو ہندوازم کو مذہب بتاتا ہے یا وہ ہندو جو ہندوازم کو فلاسفی قرار دیتا ہے وہ ہندو جو رام کو ہیرو مانتا ہے یا وہ ہندو جو راون کو ہیرو سمجھتا ہے۔ وہ ہندو جو اونچ نیچ ذات میں یقین رکھتا ہے یا وہ ہندو جو ان باتوں کو ماننے سے انکار کرتا ہے۔

اس قسم کے بے شمار فرق ہیں جو ایک ہندو اور دوسرے ہندو کے درمیان پائے جاتے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ ان میں سے کون سا ہندو ہے جو ہندوازم یا ہندو کلچر کے لیے ماڈل کی حیثیت رکھتا ہے۔ ایسی حالت میں "ہندتو" کے علم برداروں کو پہلے خود ہندوؤں کے اوپر اپنا بلڈوزر چلا کر انھیں ایک کلچر یا یکساں کلچر کا نمونہ بنانا چاہیے۔ اس کے بعد غیر ہندو فرقوں سے یہ مانگ کرنا چاہیے کہ وہ اس "ماڈل ہندو" کی پیروی کریں۔ اور اپنے کلچر کو اس کے مطابق بنائیں۔

ہندتو کے علم برداروں کو پہلے یہ کرنا ہے کہ ہندو کلچر کے ناقابلِ شمار اختلافات کو ختم کر کے اس کو ایک واحد اور یکساں کلچر بنائیں تاکہ دوسرے فرقوں کے لیے مطلوب یکساں کلچر کا ایک واضح اور متعین ماڈل سامنے آجائے اور لوگوں کے لیے اس کی پیروی قابل عمل ہو سکے۔

حقیقت یہ ہے کہ موجودہ حالت میں مسٹر گری لال جین کے الفاظ خود ہندو فرقہ پر زیادہ بڑے پیمانہ پر صادق آتے ہیں۔ ہندو فرقہ خود ایک بہت بڑا ہیومن زو ہے۔ اپنے موجودہ تنوعات کے ساتھ ہندو فرقہ کے لیے یکساں کلچر کا نمونہ بننا ممکن نہیں۔ وہ متنوع کلچر (composite culture) کا ماڈل یقیناً ہے مگر وہ یکساں کلچر کا ماڈل ہرگز نہیں۔

ہندتو کی اس کمزوری کا اعتراف خود ہندتو کے علم برداروں کو بھی کرنا پڑا ہے۔ چنانچہ وہ یہ کہنے پر مجبور ہوئے ہیں کہ ہندو کی مشترک تعریف کے لیے کوئی واضح بنیاد موجودہ حالت میں موجود نہیں۔ کیوں کہ وہ دیکھتے ہیں کہ ایک ہندو، عمومی اعتبار سے، سب سے پہلے ایک ذات سے تعلق رکھتا ہے، اس کے بعد ہی وہ ہندو برادری کا حصہ بنتا ہے :

A Hindu, generally speaking, belongs to a caste before he belongs to the Hindu fraternity.

مسٹر گری لال جین (۱۹۹۳-۱۹۲۲) نے اپنے ایک مفصل مضمون میں لکھا تھا کہ ہندو قومیت کی دو قسمیں ہیں، منفی اور مثبت۔ منفی ہندو قومیت درجات کے فرق کے ساتھ محض مسلم مخالف جذبہ پر قائم ہے۔ مثبت ہندو قومیت کا تعلق ایک ہندو تشخص کے لیے اپیل کرنے پر ہے۔ مگر چوں کہ یہ تشخص ہندوؤں کے درمیان داخلی یکسانیت نہ ہونے کی وجہ سے غیر واقعی ہے اس لیے مثبت ہندو قومیت وجود میں آنے کے قابل نہیں۔ اس طرح جو چیز ممکن ہے وہ مطلوب نہیں اور جو چیز مطلوب ہے وہ ممکن نہیں :

There are two types of Hindu communalism: negative and positive. Negative Hindu communalism consists in being merely anti-Muslim in varying degrees: positive Hindu communalism consists in appealing in the name of a Hindu identity. But since this identity is very shadowy due to Hindu's lack of internal homogeneity, positive Hindu communalism is not viable. Thus what is possible is not desirable and what is desirable is not possible. (The Times of India, New Delhi, July 4, 1987)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہندتو خود اپنے اندرونی مسائل میں اتنا زیادہ مشغول ہے کہ اس کے لیے بیرونی خطرہ بننا تقریباً ناممکن ہے۔ ہندتو بیرونی خطرہ صرف اس وقت بن سکتا ہے جب کہ مسلمان جوش اور ہنگامہ والی سیاست سے اس کو اینٹی مسلم احساس پر کھڑے ہونے کا موقع دے دیں۔ اگر مسلمان ٹکراؤ سے اعراض کی پالیسی اختیار کرلیں تو ہندتو اپنے قیام کی واحد بنیاد سے محروم ہو جائے گا۔ اس کے بعد اس کا جو انجام ہوگا اس کو لفظوں میں بتانے کی ضرورت نہیں۔

زندگی کا ایک محکم اصول یہ ہے کہ اگر کچھ لوگ ایک بے معنی نعرہ لگا رہے ہوں تو ہمیں چاہیے کہ ہم ان نعروں کو نظر انداز کر کے یہ دیکھیں کہ تاریخ کی طاقتیں کس طرف جا رہی ہیں۔ کیوں کہ زندگی میں بالآخر جو چیز باقی رہتی ہے وہ تاریخ کی طاقتیں ہیں نہ کہ کچھ غیر سنجیدہ لوگوں کے بولے ہوئے الفاظ۔

اس سلسلہ میں میں امریکہ اور کناڈا کی مثال دوں گا۔ ان ملکوں میں بھی، انڈیا کی طرح، مختلف کلچر پائے جاتے ہیں۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد وہاں کچھ انتہا پسند لیڈر اٹھے۔ انھوں نے مختلف کلچر کو ختم کر کے ایک کلچر بنانے کی تحریک چلائی۔ اس تحریک کو عام طور پر یونی کلچرلزم (uniculturalism) کہا جاتا ہے۔ مگر یہ تحریک کامیاب نہ ہو سکی۔ آخر کار انھیں ماننا پڑا کہ ان کے ملک کے لیے قابل عمل چیز صرف متنوع کلچریت (multiculturalism) ہے نہ کہ واحد کلچر۔

یہی واقعہ یقینی طور پر انڈیا میں بھی ہونے والا ہے۔ واحد کلچر کا نعرہ لگانے والے یہاں ناکام ہو کر رہ جائیں گے اور آخر کار جو چیز باقی رہے گی وہ مختلف اور متنوع کلچر کا اصول ہے جو ہزاروں سال سے اس ملک میں موجود تھا اور آج بھی وہ پوری طرح موجود ہے۔ یہی تاریخ کا فیصلہ ہے۔

نئی دہلی میں ۲۵ جولائی ۱۹۹۳ کو ایک میٹنگ تھی۔ اس کی رپورٹ ٹائمس آف انڈیا ۲۶ جولائی میں چھپ چکی ہے۔ یہاں مختلف ہندو دانش وروں نے تقریریں کیں۔ ٹائمس آف انڈیا کے ایڈیٹر

دلیپ پڈگاؤنکر (Dileep Padgaonkar) نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ اس دنیا میں ہر آدمی کی مختلف حیثیت ہوتی ہے۔ آپ اس قانون قدرت کو بدل نہیں سکتے۔ اس معاملہ میں ہمیں تنگ نظری کے بجائے وسعت نظری کا طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔

انھوں نے کہا کہ میں مہاراشٹر میں پیدا ہوا۔ اب میں دہلی میں رہتا ہوں۔ وطن، زبان، مذہب، تہذیب، تعلیم ہر لحاظ سے میری مختلف حیثیتیں ہیں۔ اسی طرح تاریخ کے اعتبار سے میری مختلف حیثیت ہے۔ میری زندگی میں قدیم بھارتی عہد کا حصہ ہے۔ پھر میری زندگی پر مسلمانوں کے ہزار سالہ عہد کی چھاپ ہے۔ اس کے بعد برٹش عہد آیا۔ اس نے بھی میری زندگی پر اثرات ڈالے۔ اب میں آزاد انڈیا کا ایک فرد ہوں۔ یہ ساری چیزیں میری زندگی کا حصہ ہیں۔ ان میں سے کسی کو بھی میں اپنے سے الگ نہیں کر سکتا۔

اس قسم کی تفصیلات بتاتے ہوئے انھوں نے مشہور انگلش رائٹر والٹ وھٹمین (Walt Whitman) کا قول دہرایا اور کہا کہ ہمیں ان تمام تضادات کے ساتھ جینا ہے۔ میں اس سے زیادہ وسیع ہوں کہ ان تمام تضادات کو اپنی زندگی میں سمو سکوں:

We all have to live with our contradictions. I am large enough to contain all these contradictions.

والٹ وھٹمین (۱۸۹۲-۱۸۱۹) کا یہ قول زندگی کی ایک حقیقت کو بتاتا ہے۔ انسان تضادات کا مجموعہ ہے اور تضادات سے نباہ کر کے ہی وہ کامیاب ہو سکتا ہے۔

انڈین کلچر اور انڈین ہسٹری کے مشہور عالم پنڈت بی این پانڈے (۸۸ سال) کا ایک انٹرویو ٹائمس آف انڈیا (۲۲ اگست ۱۹۹۳) میں چھپا ہے۔ ان سے یہ انٹرویو مسٹر ایس کالی داس نے لیا ہے۔ ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے انھوں نے کہا کہ مشکل یہ ہے کہ آج کا ہندو ہمارے دھرم کی مقدس کتابوں سے بہت کم مناسبت رکھتا ہے۔ اتھروید میں ہے کہ یہ دیش کئی مذہبوں، کئی نسلوں، کئی ذاتوں، کئی زبانوں کا دیش ہے۔ اس کے اندر مزید یہ کہا گیا ہے کہ اس دیش کو مل کر رہنے کے لیے ایک اصول کو مان لینا چاہیے۔ وہ یہ کہ یہ سرزمین ہماری مادر وطن ہے اور ہم سب اس کی سنتان ہیں۔ اس طرح پانچ ہزار سال پہلے ہم اس اصول پر متفق ہو چکے ہیں کہ اس دیس میں زبان، عقیدہ اور کلچر کے اختلاف کے باوجود ہم پُر امن طور پر ایک دوسرے کے ساتھ رہیں گے:

The trouble is that today's Hindutva has little in common with the Dharma of our scriptures. The Atharva Veda says: "This is a country of many religions, many ethnicities, many castes, many languages." It further says that to co-exist the people of this country must agree on one principle: "This land is our mother and all of us are her progeny." So even 5000 years ago we had agreed on the principles of peaceful co-existence in a clime of diversity in language, creed and culture.

انڈین کلچر کے بارہ میں یہی صحیح نقطۂ نظر ہے اور آخر کار ہمارے ملک میں یہی باقی رہنے والا ہے۔ انڈیا ماضی میں ملٹی کلچر کا ملک تھا، حال میں وہ ملٹی کلچر کا ملک ہے، اور مستقبل میں بھی وہ ملٹی کلچر کا ملک رہے گا۔ یہی تاریخ کا فیصلہ ہے۔ یہی عقل کا تقاضا ہے، اور اسی میں ملک کی ترقی کا راز چھپا ہوا ہے۔ اس کے سوا جو کچھ ہے وہ صرف نعرہ بازی ہے، نہ کہ کوئی واقعی نظریہ یا کوئی حقیقی سیاست۔

الرسالہ کیسٹ — ارکانِ اسلام سیٹ

اس وقت ارکانِ اسلام کے نام سے کیسٹوں کا ایک سیٹ زیر تیاری ہے۔ جس کی ترتیب حسب ذیل ہے۔

۱۔ حقیقتِ ایمان

۲۔ حقیقتِ نماز

۳۔ حقیقتِ روزہ

۴۔ حقیقتِ زکاۃ

۵۔ حقیقتِ حج

ایمان کے موضوع پر ابتداءہی میں ایک کیسٹ تیار کیا جا چکا ہے۔ اب بقیہ چار موضوعات پر علاحدہ علاحدہ کیسٹ بنائے جا رہے ہیں جن میں عام فہم انداز میں اسلامی عبادات کی حقیقت اور ان کے تربیتی پہلو پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ پورا سیٹ جلد ہی تیار ہو جائے گا۔

ہدیہ فی کیسٹ ۲۵ روپیہ □ ہدیہ فی سیٹ ۱۱۰ روپیہ

AL-RISALA CASSETTE C-29 Nizamuddin West New Delhi 110 013

مواقع موجود ہیں

۲۵ اکتوبر ۱۹۹۱ کا اخبار آیا تو اس میں صفحہ اول پر یہ خبر تھی کہ انڈیا اور پاکستان کے درمیان بمبئی میں ہونے والا کرکٹ میچ کینسل کر دیا گیا ہے :

Bombay Cricket match cancelled.

ٹائمس آف انڈیا (۲۵ اکتوبر) کے الفاظ میں خبر کا خلاصہ یہ تھا کہ انڈیا اور پاکستان کے درمیان ایک دن کے لیے ہونے والا انٹرنیشنل کرکٹ میچ جو بمبئی میں ۲۸ اکتوبر کو ہونے والا تھا اس کو کینسل کر دیا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میچ ہونے کی صورت میں شیوسینا نے بمبئی بند کی دھمکی دی تھی :

The one-day international cricket match between India and Pakistan scheduled to be played in Bombay on October 28 was cancelled after the Pakistan team declined to play. The Shiv Sena had threatened a Bombay bandh if the match went ahead.

یہ خبر اخبارات میں چھپی تو ایک مسلمان میرے پاس آئے۔ انھوں نے شکایت کی کہ انڈیا میں ہندو فرقہ پرستی بہت طاقت ور ہوتی جا رہی ہے۔ چنانچہ اس نے بمبئی میں ہونے والے انڈیا۔ پاکستان کرکٹ میچ کو رکوا دیا۔ میں نے کہا کہ یہ مذکورہ خبر کا ایک حصہ ہے۔ اسی کے ساتھ اس خبر میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اب یہ میچ بنگلور یا گوالیار یا مدراس میں ہوگا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ملک میں "بمبئی" اگر ایک ہے تو "غیر بمبئی" تین ہیں۔ ملک کے ایک مقام پر اگر حالات موافق نہیں ہیں تو اسی ملک میں اور بہت سی جگہیں ہیں جہاں آپ کے لیے حالات پوری طرح موافق ہیں۔ پھر کیوں آپ صرف ایک پہلو کو دیکھ رہے ہیں، دوسرا پہلو آپ کیوں نہیں دیکھتے۔

پھر میں نے کہا کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے ابتداءً مکہ میں اپنا کام شروع کیا۔ وہاں آپ کو سخت مشکلات پیش آئیں۔ مگر آپ شکایت اور احتجاج میں نہیں پڑے۔ آپ نے کہا کہ اگر میرے مخالفین مکہ میں مجھے کام نہیں کرنے دیتے تو مدینہ میں میرے لیے کام کرنے کے مواقع ہیں۔ میں وہاں جا کر اپنا کام کروں گا۔ چنانچہ آپ مکہ کو چھوڑ کر مدینہ چلے گئے۔ وہاں آپ کا کام اتنا بڑھا کہ مکہ سمیت پورے ملک میں انقلاب آگیا۔ گویا اب بھی آپ کو وہ پوزیشن حاصل ہے جو بوقت ہجرت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل تھی۔ پھر شکایت کس لیے۔

زندگی میں ہمیشہ دونوں پہلو موجود ہوتے ہیں۔ مائنس پوائنٹ بھی اور پلس پوائنٹ بھی۔ آدمی اکثر یہ غلطی کرتا ہے کہ وہ مائنس پوائنٹ میں اس طرح الجھتا ہے کہ پلس پوائنٹ اس کی نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ یہ انسان کی کمزوری ہے۔ جو لوگ اس کمزوری میں مبتلا ہوں وہی اس دنیا میں ناکام رہتے ہیں۔ اور جو لوگ اس کمزوری سے اوپر اٹھ جائیں وہ ہمیشہ کامیابی کی منزل تک پہنچتے ہیں۔

اس دنیا کو خدا نے مقابلہ (competition) کی بنیاد پر بنایا ہے۔ اسی لیے قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اس دنیا میں ہمیشہ ہر ایک کے لیے مشکلات رہیں گی۔ مگر اس کے ساتھ قرآن میں یہ خبر بھی دی گئی ہے کہ دنیا میں مشکلات کے ساتھ آسانیاں بھی لازمی طور پر موجود رہیں گی۔

ایسی حالت میں اصل قابل لحاظ بات یہ نہیں ہے کہ ہمارے راستے میں بعض مشکلات ہیں۔ اس کے بجائے زیادہ اہم اور زیادہ قابل لحاظ بات یہ ہے کہ مشکلات کے باوجود یہاں آسانیاں بھی پائی جاتی ہیں۔ یعنی ناموافق حالات (disadvantage) کے ساتھ موافق حالات (advantage) بھی یکساں طور پر بلکہ اکثر حالات میں زیادہ مقدار میں موجود ہیں۔

یہ اصول جس طرح تمام دوسرے ممالک پر منطبق ہوتا ہے اسی طرح وہ انڈیا پر بھی منطبق ہوتا ہے۔ انڈیا یقینی طور پر اس قانون فطرت سے مستثنیٰ نہیں۔ یہ صرف دیکھنے والوں کے زاویۂ نگاہ کا فرق ہے کہ وہ اس کو دیکھ نہیں پاتے۔

مسلم مسئلہ

ہندستان میں مسلمانوں کے تمام مسائل کی جڑ ان کی وہ تحریکیں ہیں جو ایجی ٹیشن کے اصول پر چلائی جاتی ہے۔ یہاں کے مسلمان اپنے لیڈروں کی رہنمائی میں پچھلے پچاس سال سے احتجاجی سیاست چلا رہے ہیں۔ کبھی مسلم یونی ورسٹی کے نام پر، کبھی مسلم پرسنل لا کے نام پر، کبھی بابری مسجد کے نام پر۔ اس قسم کی احتجاجی تحریکوں نے اس ملک میں ہندو مسلم تعلقات کو بگاڑ دیا ہے۔ دونوں کے درمیان مستقل طور پر تناؤ اور اشتعال کی حالت پیدا کر دی ہے۔ اور جہاں اکثریتی فرقہ اور اقلیتی فرقہ کے درمیان اس قسم کی صورت حال پیدا ہو جائے وہاں اقلیتی فرقہ کبھی امن اور حفاظت کے ساتھ نہیں رہ سکتا۔

کسی شخص نے مشرقی ملکوں کی سیاست پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ ان کے یہاں جلوس

کی سیاسی سرگرمیوں اور عوامی جلسوں نے گرمی زیادہ پیدا کی ہے اور روشنی کم :

Political activities of procession and public meeting have generated more heat than light.

یہ الفاظ ہندستانی مسلمانوں کی سیاست پر مکمل طور پر صادق آتے ہیں۔ یہاں کے مسلم لیڈروں نے ۱۹۴۷ سے لے کر اب تک یہی کیا کہ وہ احتجاج اور ایجی ٹیشن کے اصول پر اپنی تحریکیں چلاتے رہے۔ اس کا نتیجہ وہی ہوا جو ہونا تھا۔ ان کی تحریکوں نے صرف باہمی ناخوش گواری میں اضافہ کیا۔ ان تحریکوں سے باہمی ہمدردی کا ماحول پیدا نہ ہو سکا۔

ان نام نہاد مسلم لیڈروں نے صرف یہ جانا کہ احتجاجی تحریک چلانا ان کا قانونی حق ہے۔ مگر وہ یہ جان نہ سکے کہ عملی صورت حال ان کے موافق نہیں ہے۔ چنانچہ اس منفی سیاست نے ان کو صرف نقصان پہنچایا۔ اس کے ذریعہ وہ کوئی مثبت فائدہ حاصل نہ کر سکے۔

یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ موجودہ حالات میں اس قانونی حق کا استعمال مسلمانوں کے لیے اس کے سوا کوئی اور نتیجہ پیدا نہ کر سکا کہ جو کچھ حاصل نہیں تھا، اس کو پانے کی کوشش میں جو حاصل تھا وہ بھی ان کے ہاتھ سے جاتا رہا۔

ہندستان کے مسلمانوں کے مسائل کا سادہ اور آسان حل یہ ہے کہ وہ جس طرح باہر کے ملکوں میں جاتے ہیں اور وہاں کے حالات سے موافقت کر کے رہتے ہیں، اسی طرح وہ ہندستان کے حالات سے موافقت کر کے رہنے لگیں۔ اس کے بعد انھیں اس ملک میں امن، عزت، حفاظت، سب کچھ اسی طرح مل جائے گا جس طرح وہ ان چیزوں کو باہر کے مسلم یا غیر مسلم ملکوں میں کامل طور پر پائے ہوئے ہیں۔

تشخص کا مسئلہ

نئی دہلی کے انگریزی اخبار ہندستان ٹائمس (۲۰ مئی ۱۹۹۲) میں مسٹر وسنتھا پاتری (Vasantha R. Patri) کا ایک تجزیہ چھپا ہے۔ موضوع کے مطابق، اس کا عنوان ہے ــــ لاس اینجلیز کے فسادات، افسانہ بکھر گیا :

Los Angeles riots: Myth lies shattered

یہ مضمون امریکہ کے نسلی فسادات کے بارہ میں ہے۔ اپریل۔مئی ۱۹۹۲ میں یہ فسادات اولاً لاس اینجلیز میں ہوئے اور پھر کئی امریکی شہروں میں پھیل گئے۔ ان میں پچاس آدمی مر گئے۔ سیکڑوں زخمی ہوئے۔ کروروں روپیہ کی جائداد تباہ ہوئی، آخر کار فوج نے آکر ان کو دبا دیا۔

۱۶۱۹ میں امریکہ میں افریقہ کی سیاہ فام نسل کے لوگ بطور زرعی غلام کے لائے گئے تھے۔ یہ لوگ یہاں بس گئے۔ ان کی اولادیں ہوئیں، مگر امریکہ میں انھیں برابر کے شہری حقوق حاصل نہ ہو سکے۔ مارٹن لوتھر کنگ جونیئر جو ایک تعلیم یافتہ نیگرو تھے، ان کی قیادت میں ۱۹۶۰ میں برابری کے حقوق حاصل کرنے کی تحریک چلی۔ اب اگرچہ قانونی طور پر امریکہ کی سیاہ فام نسل کو برابر کے شہری حقوق دیے گئے ہیں، مگر عملاً یہ حق انھیں حاصل نہیں۔ چنانچہ ان کے درمیان مسلسل بے چینی موجود رہتی ہے۔ اسی کا ایک شدید اظہار پچھلے فساد میں اس وقت ہوا جب کہ لاس اینجلیز کے ایک سفید فام ڈرائیور نے ایک سیاہ فام ڈرائیور کو سڑک پر مارا۔

مضمون نگار نے اس سلسلہ میں ایک نہایت اہم پہلو کی طرف توجہ دلائی ہے جو ہندستان کے انتہا پسندوں کے لیے بھی بے حد قابل توجہ ہے۔

وہ لکھتے ہیں کہ امریکہ برابر یہ کوشش کرتا رہا ہے کہ وہ یک طرفہ طور پر سیاہ فام نسل کو سفید فام نسل میں شامل کرے جس میں ہر آدمی سفید فام امریکی نقشہ میں ڈھل جائے۔ مگر حالیہ فساد نے اس نقطۂ نظر کی ناکامی کو ثابت کر دیا ہے۔ اب ضروری ہے کہ اس نقطۂ نظر میں تبدیلی پیدا کی جائے۔ اس کا حل صرف یہ ہے کہ تہذیبی تنوع کی حوصلہ افزائی کی جائے اور نسلی امتیاز کا خاتمہ کر دیا جائے۔ یہی دنیا کی سب سے زیادہ دولت مند جمہوریت میں یک جہتی لانے کی واحد ضمانت ہے :

America has all along attempted a one-way assimilation, whereby everyone could be shaped into the Anglo-mould. From the latest manifestation of the failure of this approach a shift in emphasis can be considered. Encouraging cultural pluralism and active prevention of ethnic discrimination alone can ensure the integration of the world's richest democracy. (p.13)

مضمون نگار کا یہ تبصرہ ہندستان کے لیے بھی اتنا ہی اہم ہے جتنا امریکہ کے لیے۔ اگرچہ دولت اور طاقت کے اعتبار سے دونوں ملکوں میں بہت زیادہ فرق ہے۔ تاہم جہاں تک مذکورہ مسئلہ کا تعلق ہے، وہ دونوں جگہ یکساں طور پر پایا جاتا ہے۔

ہندستان میں بھی ایک طبقہ ہے جو اسی ڈھنگ پر سوچتا ہے جس طرح امریکہ کے سفید فام لوگ سوچتے ہیں۔ ان کے ذہن میں ایک خود ساختہ بھارتیہ ماڈل ہے، اور وہ چاہتے ہیں کہ دوسرے تمام فرقے اور گروہ اسی ماڈل میں اپنے آپ کو ڈھال لیں۔ اس نقطۂ نظر کو کچھ لوگ بھارتیہ کرن کا نام دیتے ہیں اور کچھ لوگ اس کو انڈینائزیشن کہتے ہیں۔

مگر یہ ہندستان میں بھی اسی طرح ناقابل عمل ہے جس طرح وہ امریکہ میں ناقابل عمل ہے۔ اس قسم کے ہر نظریہ کا مطلب تاریخی حقیقتوں سے لڑنا ہے۔ اور تاریخی حقیقتوں سے لڑنا ایسا ہی ہے جیسے پتھر کی چٹان سے اپنا سر ٹکرانا اور پھر خود اپنا سر توڑ لینا۔

مضمون نگار نے بجا طور پر امریکی مسئلہ کا حل کلچرل پلورلزم کو بتایا ہے۔ یعنی ملک کے ہر تہذیبی گروہ کو اپنے تشخص پر قائم رہنے کا موقع دینا اور اس کی حوصلہ افزائی کرنا۔ یہی ہندستان کے مسئلہ کا حل بھی ہے۔ ہندستان ایک بڑا ملک ہے۔ یہاں مختلف تہذیبی گروہ آباد ہیں۔ ان گروہوں کے تہذیبی تشخص کو مٹانے کی کوشش ملک میں فساد تو برپا کر سکتی ہے۔ مگر وہ خود تشخص کو ختم کرنے میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔

اس لیے حقیقت پسندی یہ ہے کہ ہر ایک کے انفرادی تشخص کو تسلیم کیا جائے۔ ہندستان کو ایک باغ کی حیثیت دی جائے جہاں طرح طرح کے پھول اور پودے دکھائی دے رہے ہوں نہ کہ صرف ایک پھول اور صرف ایک پودا۔ ہندستانی سماج کی کامیاب تشکیل صرف تنوع کے اصول پر ہو سکتی ہے، وہ یکسانیت کے اصول پر کبھی نہیں ہو سکتی۔

انفرادی تصویر، مجموعی تصویر

ایک مسلمان تاجر نے اپنے حالات بتاتے ہوئے کہا کہ ہمارا بزنس زیادہ تر ہندو صاحبان سے ہوتا ہے۔ وہ ڈیلنگ میں بہت اچھے ہیں۔ مجھے ان سے کوئی شکایت نہیں۔ یہ کسی ایک مسلمان کی بات نہیں۔ آپ جس مسلمان سے پوچھیں۔ وہ خواہ وکیل ہو یا ڈاکٹر، دکان دار ہو یا کوئی ادارہ چلاتا ہو، ہر ایک اپنے ذاتی تجربہ کے اعتبار سے ہندو کو ہمیشہ اچھا بتائے گا۔

مگر انھیں مسلمانوں سے ہندستان میں مسلم ملت کے مسائل پر بات کیجئے تو ہر مسلمان فوراً ہندو کی شکایت کرنے لگے گا۔ وہ کسی ایک یا دوسرے الفاظ میں کہے گا کہ ـــــ ہندو متعصب ہے۔ ہندو فساد کرتا ہے۔ ہندو مسجد گراتا ہے۔ ہندو یہاں کے مسلمانوں کو ختم کر دینا چاہتا ہے۔ ـــ

ایک ہی مسلمان کی رائے میں یہ فرق کیوں۔ کیا وجہ ہے کہ ہر مسلمان ایک اعتبار سے ہندو کی تعریف کرتا ہے، اور وہی مسلمان دوسرے اعتبار سے ہندو کو برا بتاتا ہے۔

اس کی وجہ بالکل سادہ ہے۔ کوئی مسلمان جب ذاتی تجربہ کے اعتبار سے ہندو کے بارہ میں رائے دیتا ہے تو اس کے ذہن میں ہندو کی انفرادی تصویر (individual picture) ہوتی ہے۔ اور جب وہ ملی نقطۂ نظر سے ہندو کے بارہ میں سوچتا ہے تو اس کے ذہن میں ہندو کی اجتماعی تصویر (collective picture) آجاتی ہے۔ انفرادی تصویر میں صرف ایک ہندو کا سلوک اس کے سامنے ہوتا ہے، اجتماعی تصویر میں تمام ہندوؤں کا عمومی سلوک اس کے سامنے آجاتا ہے۔

انفرادی تصویر میں ہندو اس کو ایک اچھا انسان دکھائی دیتا ہے۔ کیونکہ ہر انسانی گروہ کی طرح، ہندوؤں کی بھی ۹۵ فی صد تعداد اچھی ہی ہے۔ مگر اجتماعی تصویر میں بیک وقت پورا ہندو فرقہ مجموعی شکل میں اس کے سامنے آجاتا ہے۔ اس مجموعی تصویر میں اس کو کہیں دکھائی دیتا ہے کہ ایک شہر سے فساد کا دھواں اٹھ رہا ہے۔ کہیں ایک مسجد گرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ کہیں کوئی ہندو کسی مسلمان کے ساتھ تعصب کا معاملہ کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

یہی معاملہ برعکس صورت میں ہندو کا بھی ہے۔ کسی ہندو سے آپ بات کریں تو وہ انفرادی تعلق کے اعتبار سے مسلمان کی تعریف کرے گا۔ ہندو تاجر، ہندو ڈاکٹر، ہندو وکیل، ہندو کارخانہ دار اپنے

تجربہ میں آنے والے مسلمان کے بارہ میں ہمیشہ اچھے کلمات کہیں گے۔

مگر جب ہندو سے فرقہ وارانہ مسائل پر گفتگو ہو تو آپ دیکھیں گے کہ ہندو فوراً مسلمان کا شاکی ہو گیا ہے۔ اب مسلمان اس کو ایسے گروہ کی صورت میں دکھائی دینے لگے گا جو ملک کے لیے صرف بوجھ ہو، اس سے ملک کو کوئی فائدہ ملنے والا نہ ہو۔

اس فرق کی وجہ بھی وہی ہے جو اوپر بیان ہوئی۔ مسلمانوں میں بھی، دوسرے انسانی گروہوں کی طرح، زیادہ تر اچھے لوگ ہی ہیں۔ اس لیے مسلمان، انفرادی تجربہ میں، ہندو کو اچھا ہی دکھائی دیتا ہے۔ مگر کوئی ہندو جب مسلمانوں کی اجتماعی تصویر کو سامنے رکھ کر غور کرتا ہے تو اس کو نظر آتا ہے کہ مسلمان کہیں ہندوؤں کا جلوس روک رہے ہیں۔ کہیں کوئی مذہبی اشو لے کر ہندوؤں سے لڑ رہے ہیں۔ کہیں ہندوؤں کے راستہ میں رکاوٹ ڈالے ہوئے ہیں۔

اس طرح کے معاملات میں اگرچہ تھوڑے ہی مسلمان ملوث ہوتے ہیں مگر مجموعی تصویر میں ایسے واقعات پورے مسلم فرقہ سے منسوب ہو جاتے ہیں۔ اور تمام مسلمانوں کی تصویر بگاڑنے کا سبب بنتے ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ کوئی مسلمان جب ہندو کو برا کہتا ہے تو وہ جنرلائزیشن (generalization) کا شکار ہو رہا ہوتا ہے۔ اسی طرح کوئی ہندو جب مسلمان کو برا سمجھتا ہے تو وہ بھی جنرلائزیشن کی بنا پر ایسا سمجھتا ہے۔ مسلمان اور ہندو دونوں اگر معاملہ کی اس نوعیت کو سمجھ جائیں تو وہ ایسا نہیں کریں گے کہ ایک کی بنا پر سب کو برا سمجھنے لگیں۔ اور جب وہ ایسا کریں گے تو دونوں فرقوں کے درمیان تعلقات اپنے آپ درست ہو جائیں گے۔

زرِ تعاون الرسالہ

ہندستان کے لیے		بیرونی ممالک کے لیے	(ہوائی ڈاک)	(بحری ڈاک)
ایک سال	Rs 70	ایک سال	$20 / £10	$10 / £5
دو سال	Rs 135	دو سال	$35 / £18	$18 / £8
تین سال	Rs 200	تین سال	$50 / £25	$25 / £12
پانچ سال	Rs 300	پانچ سال	$80 / £40	$40 / £18

تعمیر شعور

قومی یک جہتی کی اہمیت سب سے پہلے ہندستان کے سابق وزیر اعظم جواہر لال نہرو نے محسوس کی۔ انھوں نے اس موضوع پر پہلی باقاعدہ کانفرنس بلائی۔ اس کا اجلاس نئی دہلی میں ۲۸ ستمبر تا یکم اکتوبر ۱۹۶۱ کو ہوا۔ اس کانفرنس کے فیصلہ کے مطابق، اس خاص مقصد کے لئے ایک مستقل تنظیم نیشنل انٹگریشن کونسل (قومی یک جہتی کونسل) کے نام سے قائم کی گئی۔

اس کونسل کا پہلا کام یہ تھا کہ وہ تمام متعلقہ مسائل کا جائزہ لے کر ضروری سفارشیں حکومت کے سامنے پیش کرے۔ اس کے مطابق، اس کا اجلاس ۲ - ۳ جون ۱۹۶۲ کو ہوا۔ اس اجلاس نے طے کیا کہ لسانی تعصب، علاقائی علیحدگی پسندی اور فرقہ واریت، یہ تین چیزیں قومی یک جہتی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔ اس لئے ان رکاوٹوں کو دور کرنے پر توجہ صرف کی جائے۔

۱۹۶۲ کے اس اجتماع کے بعد کئی سال تک نیشنل انٹگریشن کونسل کی کوئی مزید سرگرمی نہ ہو سکی۔ آخر کار مسز اندرا گاندھی نے اپنے اقتدار کے زمانہ میں اس کو زندہ کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ ۲۰ - ۲۱ جون ۱۹۶۸ کو سرینگر میں اس کا اجلاس بلایا گیا۔ سرینگر کی ٹھنڈی فضا میں نیشنل انٹگریشن کونسل کا یہ اجلاس ختم ہوا تو لوگوں نے اس سے کافی امیدیں وابستہ کیں۔ نادرن انڈیا پتریکا (۲۳ جون ۱۹۶۸) نے اس کی رپورٹ دیتے ہوئے اس پر یہ سرخی قائم کی کہ فرقہ واریت کو ختم کرنے کے لئے دوررس اقدامات:

Far-reaching steps to end communalism.

سرینگر کے اجلاس میں نیشنل انٹگریشن کونسل نے کچھ سفارشات اتفاق رائے سے منظور کیں۔ ان سفارشات کا خلاصہ یہ تھا کہ ہر سطح پر فرقہ وارانہ کشیدگی کو ختم کرنے کی کوشش کی جائے۔ مثلاً حکومت اس مقصد کے لئے سراغ رسانی کے خصوصی یونٹ قائم کرے۔ اس معاملہ میں جو سرکاری افسران اپنے فرائض سے کوتاہی کرتے ہوئے پائے جائیں ان کو سزا دی جائے۔ فرقہ وارانہ جھگڑوں کی سماعت کے لئے خصوصی عدالتیں قائم کی جائیں۔ قانون تعزیرات ہند کی دفعہ ۱۵۳ میں ترمیم کر کے فرقہ وارانہ سرگرمیوں کو قابل تعزیر جرم قرار دیا جائے۔ سرکاری ملازمین کی بھرتی میں کسی قسم کا امتیاز نہ برتا

جائے۔ تیوہاروں کو مشترک طور پر منانے کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ وغیرہ

اس طرح قومی یک جہتی یا نیشنل انٹگریشن کی کوششوں پر اب ۳۰ سال گزر چکے ہیں۔ مگر اب تک اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اس مدت میں قومی کشیدگی اور قومی اختلافات اس سے بھی زیادہ ہو گئے جو ۳۰ سال پہلے ہمارے ملک میں پائے جاتے تھے۔

میں نے اس موضوع پر کافی غور کیا ہے اور اس معاملہ میں دوسرے ملکوں کے حالات کا بھی مطالعہ کیا ہے۔ آخر کار میں جس نتیجہ پر پہنچا ہوں وہ یہ ہے کہ ہمارے ملک میں قومی یک جہتی نہ ہونے کا جو اصل سبب ہے اس کو دور کرنا ہوگا۔ اس کے بغیر ملک کے اندر قومی جہتی کی فضا پیدا نہیں ہو سکتی۔ اور وہ سبب ہے شعور کی کمی۔

اس صورت حال کی اصلاح کے لئے عام طور پر جو تجویزیں پیش کی جاتی ہیں وہ تقریباً سب کی سب سسٹم یا نظام سے تعلق رکھتی ہیں۔ مگر اس طرح کی سماجی خرابیاں سسٹم کے بدلنے سے درست نہیں ہوتیں۔ ان خرابیوں کا تعلق تمام تر افراد سے ہے۔ یہ دراصل افراد ہیں جو سسٹم کو چلاتے ہیں۔ اس لئے سسٹم کو درست کرنے کے لئے افراد کو درست کرنا ہوگا۔

کسی سماج کا درست ہونا تمام تر اس پر منحصر ہے کہ اس کے افراد کا مزاج درست ہو۔ مثال کے طور پر جاپان کے افراد کا مزاج یہ ہے کہ ان کے اوپر کوئی سردار متقرر کیا جائے تو وہ فوراً اس کی ماتحتی کو قبول کر لیتے ہیں۔ اس لئے جاپان کے سماج میں اتحاد ہے۔ اس کے برعکس ہمارے ملک کے افراد کا مزاج یہ ہے کہ وہ کسی کی ماتحتی کو قبول نہیں کرتے، اس لئے ہمارے ملک کے سماج میں اتحاد نہیں۔

میں نے اس سلسلہ میں جاپان کی تاریخ کا کافی مطالعہ کیا۔ میں نے پایا کہ جاپان میں یہ مزاج تعلیم کے ذریعہ آیا۔ جاپان میں ہر شخص تعلیم یافتہ ہے۔ مزید یہ کہ اسکول کی سطح پر ان کے یہاں تعلیم کا نہایت اعلیٰ انتظام ہے۔ اس طرح جاپان کا ہر شخص نہ صرف تعلیم یافتہ ہے بلکہ وہ شعوری حیثیت سے بیدار ہے اور اپنے اندر تعمیری ذہن رکھتا ہے۔

اس مطالعہ کے بعد، نیز دوسرے تاریخی پہلوؤں کا مطالعہ کرنے کے بعد میری قطعی رائے ہے کہ ہندستان کے سماجی جھگڑوں کا واحد حل یہ ہے کہ قوم کو صد فی صد تعلیم یافتہ بنایا جائے۔ قوم

کے ہر فرد کے اندر تعمیری شعور پیدا کیا جائے۔ جس دن ایسا ہو گا اسی دن ملک کے اندر وہ چیز بھی پیدا ہو جائے گی جس کو قومی یک جہتی کہا جاتا ہے۔

اس نظریہ کی صحت کی ایک مثال خود ہمارے ملک میں موجود ہے۔ ہندستان میں عمومی سطح پر لٹریسی، انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) کے بیان کے مطابق ۳۶ فیصد ہے۔ مگر جنوبی ہندستان کی ایک ریاست کیرلا میں لٹریسی تقریباً صد فی صد تک پہنچ چکی ہے۔ اس فرق کا نتیجہ یہ ہے کہ بقیہ ہندستان میں طرح طرح کے جھگڑے جاری رہتے ہیں۔ مگر کیرلا کی ریاست سماجی جھگڑوں سے تقریباً پاک ہے۔ یہ تجربہ بتاتا ہے کہ تعلیم کی کمی سے شعوری ناپختگی پیدا ہوتی ہے۔ اور تعلیم کا اضافہ لوگوں کے اندر شعوری بالیدگی پیدا کر دیتا ہے۔ اور جہاں شعوری بالیدگی آجائے وہاں غیر ضروری جھگڑے اپنے آپ ختم ہو جائیں گے۔

تمام ترقی یافتہ ملکوں میں لازمی تعلیم کا اصول رائج ہے۔ ہر ترقی یافتہ سماج میں گورنمنٹ اس بات کی ذمہ دار ہے کہ وہ ہر شخص کو تعلیم یافتہ بنائے۔ چنانچہ ان قوموں اور سماجوں میں ہر آدمی تعلیم یافتہ ہے۔ یہی وہ بنیادی فرق ہے جس نے ترقی یافتہ سماج اور پس ماندہ سماج میں وہ فرق پیدا کر رکھا ہے جس کو آج ہم دیکھ رہے ہیں۔

انڈیا میں ابھی لازمی تعلیم کے اصول کو رائج نہ کیا جا سکا۔ آزادی کے بعد دستور ہند میں اس سے کمتر درجہ میں ایک معیار طے کیا گیا تھا۔ مگر اس کو بھی ابھی تک زیر عمل نہ لایا جا سکا۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا نے اس کو ان الفاظ میں ریکارڈ کیا ہے —— انڈیا اس دستوری ہدایت کو زیر عمل لانے میں ناکام رہا ہے کہ وہ چھ سال سے چودہ سال کی عمر کے تمام بچوں کے لئے عمومی تعلیم کا انتظام کرے:

India has failed to carry out the constitutional directive of providing universal education for children in the age group of six to 14. (6/394)

میں سمجھتا ہوں کہ ہندستانی سماج میں قومی یک جہتی پیدا نہ ہونے کا بنیادی سبب یہی ہے۔ ہمارا سماج تعلیم میں پچھڑا ہوا ہے۔ اس لئے وہ شعور میں پچھڑا ہوا ہے۔ اور جو قوم شعور میں پیچھے ہو جائے وہ سماجی

تعمیر میں بھی اسی نسبت سے پیچھے ہو جائے گی۔

تاہم اس کام کو صرف حکومت پر چھوڑنا درست نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر ہندستانی کو اس میں اپنا حصہ ادا کرنا چاہئے۔ ایک آدمی اگر صرف ایک آدمی کو پڑھا سکتا ہے تو وہ ایک آدمی کو پڑھائے۔ ایک آدمی ابتدائی سطح پر بچوں کی تعلیم کا انتظام کر سکتا ہے تو وہ ابتدائی سطح پر بچوں کی تعلیم کا انتظام کرے۔ کچھ لوگ اسکول اور کالج کھولنے کی طاقت رکھتے ہوں تو وہ اسکول اور کالج کھول کر نوجوانوں کی تعلیم کا بندوبست کریں۔ غرض ہر آدمی اپنے اپنے حالات کے اعتبار سے اس مہم میں شریک ہو جائے۔

جب یہ تعلیمی مہم کامیاب ہوگی اور قوم صد فی صد تعلیم یافتہ ہو جائے گی تو اس وقت نہ صرف ملک میں قومی یک جہتی آچکی ہوگی بلکہ مزید تمام اوصاف کو حاصل کر کے ہمارا سماج ایک ترقی یافتہ سماج بن جائے گا جس کا ہم پچھلے پچاس سال سے انتظار کر رہے ہیں۔

ایک اور پہلو

۳۰ برس کی کوششوں کے باوجود ہمارے ملک میں قومی ایکتا نہیں آئی۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ قومی ایکتا لانے کا جو طریقہ اپنایا گیا وہ درست نہ تھا۔

اس مدت میں ملک کے لیڈروں اور دانشوروں پر یہ خیال چھایا رہا ہے کہ "ایکتا" لانے کے لئے "انیکتا" کو ختم کرنا پڑے گا۔ اسی ذہن کے تحت اس پر زور دیا جا رہا ہے کہ ملک میں سول میرج کا قانون نافذ کیا جائے۔ تمام لوگوں کو ایک کلچر میں ڈھال دیا جائے۔ جو لوگ زیادہ انتہا پسند ہیں وہ پرجوش طور پر کہتے ہیں کہ تمام لوگ رام کو اپنا پروج مانیں۔ تمام لوگ اپنے کو ہندو کہیں۔ وغیرہ۔ اس کو یہ حضرات تہنید (Indianisation) کہتے ہیں۔ مگر اس قسم کی یکسانیت عملاً ناممکن ہے۔ اس لئے وہ اب تک وقوع میں بھی نہ آسکی۔

کناڈا قومی ایکتا کے لئے ایک مثالی ملک کی حیثیت رکھتا ہے۔ حالاں کہ کناڈا میں اسی طرح مختلف مذہب اور تہذیب کے لوگ رہتے ہیں جس طرح ہندستان میں۔ کناڈا میں یہ قومی ایکتا جس طرح حاصل کی گئی ہے، اس کو وہ لوگ کثیر کلچریت (multiculturalism) کہتے ہیں۔ انھوں نے اپنے مختلف فرقوں میں ایکتا لانے کے لئے یکساں کلچر (uniculturalism) کی تحریک نہیں چلائی۔ بلکہ وسیع تر قومی ڈھانچہ کے اندر ہر ایک کی جداگانہ اکائی کو مان لیا۔ اسی اصول پر چل کر کناڈا ترقی

کر رہا ہے۔ ہندستان کی ترقی بھی اسی طرح ہو سکتی ہے کہ وہ اس آزمودہ طریقہ کو اپنے یہاں اختیار کرلے۔

۱۳ نومبر ۱۹۹۱ کو شولاپور (مہاراشٹر) میں قومی ایکتا کے موضوع پر ایک اجتماع تھا۔ اس میں مختلف لوگوں نے تقریریں کیں۔ شولاپور کی ایک معروف شخصیت اور سابق ایم ایل اے شری تلسی داس جادھو نے بھی تقریر کی۔ انھوں نے اپنی تقریر میں اس نقطۂ نظر کی حمایت کی کہ اصل چیز موافقت اور رواداری کا مزاج ہے۔ اگر یہ مزاج ہو تو بڑے بڑے اختلاف کے باوجود باہمی میل ملاپ قائم ہو سکتا ہے۔

انھوں نے اپنے گھر کی مثال دیتے ہوئے کہا کہ میرے باپ نان ویجیٹیرین تھے اور میری ماں ویجیٹیرین تھی۔ اس کے باوجود دونوں میں کوئی اختلاف نہ تھا۔ میں نے اپنے گھر میں دیکھا ہے کہ میری ماں روزانہ صبح اٹھ کر نہاتیں اور میرے باپ کے لئے میٹ بنا کر اس کو کھانے کی میز پر رکھ دیتیں۔ اس کے بعد وہ دوبارہ نہاتیں اور اپنے لئے دال سبزی والا کھانا بناتیں۔ اسی طرح وہ آخر عمر تک کرتی رہیں۔ کھانے پینے کے معاملہ میں دونوں کے درمیان اتنا بڑا اختلاف تھا۔ مگر دونوں زندگی بھر عزت اور محبت کے ساتھ مل کر رہے۔

حقیقت یہ ہے کہ خاندانی ایکتا ہو یا قومی ایکتا، ہر ایک کا تعلق ذہنی رویہ (mental attitude) سے ہے نہ کہ کلچر کی یکسانیت سے۔ انسانوں کے درمیان مختلف قسم کے فرق ہوتے ہیں۔ حتی کہ ایک گھر کے اندر چند آدمی ہیں تو ان میں بھی طرح طرح کا اختلاف ہوگا۔ اس کا حل اختلاف کو مٹانا نہیں ہے۔ بلکہ اختلاف کو گوارا کرنا ہے۔ اختلاف کو مٹانے کی کوشش اختلاف کو بڑھاتی ہے۔ جبکہ اختلاف کو گوارا کرنے کی پالیسی اختلاف کو عملاً ختم کر دیتی ہے۔

مسٹر نکسٹ کا عظیم رول

دو بھائی ہوں تو ان میں سے ایک بڑا ہوگا اور ایک چھوٹا۔ دوسرے لفظوں میں، ایک مسٹر فرسٹ (Mr First) ہوگا اور دوسرا مسٹر نکسٹ (Mr Next) اسی طرح ہر انسانی مجموعہ میں ہمیشہ کوئی مسٹر فرسٹ ہوتا ہے اور کوئی مسٹر نکسٹ۔ یہ فطرت کا ایک ابدی قانون ہے۔ فطرت کے اس قانون کو ماننے ہی میں تمام ترقیوں کا راز چھپا ہوا ہے۔

تمام انسانی سماجوں کا تجربہ بتاتا ہے کہ مسٹر نکسٹ اگر یہ حقیقت پسندی اختیار کرے کہ وہ فرسٹ پارٹی کے مقابلہ میں مسٹر نکسٹ کی پوزیشن قبول کرنے پر راضی ہو جائے تو خاندان یا ادارہ یا ملک ترقی کرتا ہے۔ اور اگر مسٹر نکسٹ اس اعتراف واقعہ پر راضی نہ ہو تو اس کے بعد ترقی کا عمل بھی لازمی طور پر رک جائے گا۔ ظاہری تقسیم میں مسٹر نکسٹ کی حیثیت اگرچہ "نکسٹ" ہوتی ہے مگر عملی اعتبار سے اس کا رول اتنا قطعی (crucial) ہے کہ ہر انسانی مجموعہ میں وہ کلیدی حیثیت کا حامل بن جاتا ہے۔ تاریخ سازی میں مسٹر نکسٹ کا رول نہایت عظیم ہے۔

تاریخ کے تمام بڑے واقعات اسی وقت ظہور میں آئے ہیں جب کہ دو شریک پارٹیوں میں سے ایک پارٹی نے اجتماعی عمل میں مسٹر نکسٹ بننا تسلیم کر لیا۔ اور جہاں ایسا نہیں ہوا وہاں یقینی طور پر کوئی بڑا واقعہ بھی ظہور میں نہ آسکا۔

تمام ترقیوں کا راز اس میں چھپا ہوا ہے کہ انسان کی صلاحیتیں بھرپور طور پر زندگی کی تعمیر کے لیے استعمال ہوں۔ اور انسانی صلاحیتوں کے اس تعمیری استعمال کی صورت صرف یہ ہے کہ فطرت کی تقسیم میں جو مسٹر نکسٹ ہے وہ مسٹر نکسٹ کی حیثیت قبول کرنے پر بخوشی راضی ہو جائے۔

اس قبولیت کی حالت میں سماج کے اندر مثبت سرگرمیاں جنم لیتی ہیں اور عدم قبولیت کی حالت میں منفی سرگرمیاں وجود میں آتی ہیں۔ ایک صورت میں اعلیٰ انسانی قدروں کی روایتیں قائم ہوتی ہیں اور دوسری صورت میں پست انسانی قدروں کا رواج ہر طرف پھیل جاتا ہے۔ ایک صورت میں سماج مشترک جدوجہد کا نمونہ بنتا ہے اور دوسری صورت میں پورا سماج باہمی ٹکراؤ کا جنگل بن جاتا ہے۔

چند مثالیں

۶۳۲ء میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات مدینہ میں ہوئی۔ اس وقت مسلمانوں کی جماعت میں دو بڑے گروہ تھے۔ ایک مہاجر، دوسرے انصار۔ اب سوال یہ تھا کہ خلیفہ (پیغمبر کا سیاسی جانشین) کون ہو۔ اس وقت انصار نے کہا کہ: منا امیر ومنکم امیر (ایک امیر ہم میں سے اور ایک امیر تم میں سے) یہ گویا دونوں فریقوں کے درمیان سیاسی مساوات کا فارمولا تھا جو مدینہ کے انصار کی طرف سے پیش کیا گیا۔

مگر اصحاب رسول کی اکثریت نے سیاسی مساوات کے اس اصول کی مخالفت کی۔ کیوں کہ بظاہر خوش نما ہونے کے باوجود وہ قابل عمل نہیں تھا۔ مہاجر بزرگ عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اس کے بجائے دوسرا فارمولا ان لفظوں میں پیش کیا کہ: نحن الامراء وانتم الوزراء (ہم امیر ہوں اور تم وزیر) دوسرے لفظوں میں یہ کہ، انصار اپنے آپ کو مسٹر نکسٹ کے مقام پر رکھ کر مہاجرین کو مسٹر فرسٹ کا درجہ دینے پر راضی ہو جائیں۔

مہاجر گروہ کے بزرگ ترین فرد ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس فارمولا کے حق میں مفصل تقریر کی اور اس کی تائید میں یہ حدیث رسول پیش کی کہ: الائمۃ من قریش (امام قریش میں سے ہوں گے) آخر کار انصار کا گروہ نئے سیاسی نظام میں مسٹر نکسٹ بننے پر راضی ہو گیا۔ ان کی اس رضامندی نے اسلام کی تاریخ کو آگے بڑھا دیا۔ اگر خدا نخواستہ مدینہ کے انصار مسٹر نکسٹ بننے پر راضی نہ ہوتے تو پیغمبر اسلام کی وفات کے بعد ہی دونوں مسلم گروہوں کے درمیان عہدوں کی لڑائی چھڑ جاتی۔ اور پھر شاید اسلام کی تاریخ ہمیشہ کے لیے مدینہ میں دفن ہو جاتی۔

اب انڈیا کی مثال لیجئے۔ ۱۹۴۷ میں جب انڈیا ایک آزاد ملک کی حیثیت سے وجود میں آیا تو اس وقت انڈین نیشنل کانگریس میں دو سب سے زیادہ ابھرے ہوئے لیڈر تھے جن میں سے کسی ایک کو نئے ہندستان کا وزیر اعظم بننا تھا۔ ایک پنڈت جواہر لال نہرو، دوسرے سردار ولبھ بھائی پٹیل۔ کانگریس پارٹی میں دونوں کے حامی موجود تھے۔

اس وقت مہاتما گاندھی نے دانش مندی سے کام لیا اور پنڈت نہرو کے حق میں اپنی رائے دے دی۔ سردار پٹیل کے لیے بلاشبہ یہ ایک سخت فیصلہ تھا۔ تاہم انھوں نے اپنی حیثیت کا

اعتراف کرتے ہوئے ہندستان کے نئے سیاسی نظام میں اپنے لیے مسٹر نکسٹ کا رول منظور کر لیا۔
سردار پٹیل کی اسی حقیقت پسندی کا یہ نتیجہ تھا کہ آزادی کے بعد انڈیا میں سیاسی عہدوں کی جنگ برپا نہیں ہوئی اور کسی رکاوٹ کے بغیر ملکی ترقی کا سفر شروع ہو گیا۔ سردار پٹیل اگر مسٹر نکسٹ بننے پر راضی نہ ہوتے تو کبھی ایسا ہونا ممکن نہ تھا۔

پاکستان میں بدقسمتی سے برعکس صورت پیش آئی۔ ۱۹۴۷ میں پاکستان وجود میں آیا تو اس کے دو بڑے جغرافی حصے بنے۔ ایک موجودہ بنگلہ دیش اور دوسرا سابق مغربی پاکستان۔ تاریخی اور سیاسی اسباب نے مغربی پاکستان کے لیے مسٹر فرسٹ کا رول لکھ دیا تھا اور بنگلہ دیش (مشرقی پاکستان) کے لیے مقدر تھا کہ وہ نومولود ریاست میں مسٹر نکسٹ کا رول ادا کرے۔ لیکن بنگلہ دیش کو یہ پسند نہیں آیا کہ وہ مسٹر نکسٹ کی سیٹ پر بیٹھے۔ اس کا یہ اندوہناک نتیجہ نکلا کہ وجود میں آنے کے صرف ۲۴ سال بعد پاکستان کا "خداداد ملک" دو ٹکڑے ہو گیا۔ ایک طاقت ور ملک دو کمزور خطوں میں بٹ کر رہ گیا۔

تاہم پاکستان میں اعتراف واقعہ کی بھی ایک جزئی مثال موجود ہے۔ تقسیم کے بعد پاکستان میں تقریباً دو ملین ہندو باقی رہ گئے تھے۔ یہ ہندو وہاں کی مسلم اکثریت کے مقابلہ میں مسٹر نکسٹ کی حیثیت رکھتے تھے۔ پاکستان کے ہندو نے ایک دن کی تاخیر کے بغیر اپنی وہ حیثیت تسلیم کر لی جو تاریخی حالات نے اس کے لیے مقدر کی تھی۔ اس کا نتیجہ اس کے حق میں شاندار نکلا۔ آج پاکستان میں یہ مسٹر نکسٹ وہاں کے مسٹر فرسٹ سے زیادہ محفوظ، زیادہ خوش حال اور زیادہ ترقی یافتہ زندگی کے مالک بنے ہوئے ہیں۔ یہ بات خود پاکستان کے ایک سروے کے ذریعہ معلوم ہوئی ہے۔

ہندو مسلم مسئلہ

انڈیا میں ہندوؤں اور مسلمانوں کا معاملہ بھی اسی قانونِ فطرت کے تحت آتا ہے۔ اس قانونِ خداوندی کو ہمیں دل کی آمادگی کے ساتھ مان لینا ہے۔ اگر ہم اس کو نہ مانیں تو فطرت کا قانون تو نہ بدلے گا۔ البتہ ہم ابدی طور پر ایک تباہ شدہ گروہ بن کر رہ جائیں گے۔

انڈیا کے تاریخی، سماجی اور سیاسی حالات نے اس ملک میں ہندو کو مسٹر فرسٹ کی حیثیت دے دی ہے۔ اور مسلم فرقہ کے لیے یہ مقدر کر دیا ہے کہ کم از کم فی الحال وہ اس عظیم ہندستانی

سماج کے اندر مسٹر نکسٹ کا رول ادا کرے۔ یہ فطرت کا فیصلہ ہے۔ اور فطرت کا فیصلہ خود خدا کا فیصلہ ہوتا ہے۔ مسلمانوں کو یہاں مسٹر نکسٹ کی پوزیشن کو اسی طرح تسلیم کرنا ہے جس طرح وہ دوسرے قوانین الٰہی کو اٹل سمجھ کر اسے تسلیم کرتے ہیں۔

حقیقت اپنی ذات میں حقیقت ہوتی ہے۔ عقل مند وہ ہے جو حقیقت کو عزت کے ساتھ مان لے۔ کیوں کہ حقیقت کو اگر عزت کے ساتھ نہ مانا جائے تو آخر کار اسے ذلت کے ساتھ ماننا پڑے گا۔

ہندستان کی آزادی پر نصف صدی پوری ہو رہی ہے۔ مگر اب تک ہندستان وہ ترقی نہ کر سکا جو اپنے امکانات کے اعتبار سے اسے کرنا چاہیے تھا۔ اس المیہ کا واحد بڑا سبب اکثریتی فرقہ اور اقلیتی فرقہ کی نزاع ہے۔ دونوں کے درمیان یہ مسلسل نزاع اسی لیے قائم ہے کہ جو فرقہ مسٹر نکسٹ ہے وہ مسٹر نکسٹ بن کر رہنے کے لیے تیار نہیں۔

انڈیا میں اور بھی کئی اقلیتیں ہیں۔ مگر مسلم گروہ یہاں مسٹر نکسٹ ہے، کیوں کہ وہی نکسٹ ٹو مجاریٹی کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ فرق کسی سازش کی بنا پر نہیں ہے بلکہ اسی خالق کے منصوبہ کے تحت ہے جو کسی کو پہلے بھائی کی حیثیت سے پیدا کرتا ہے اور کسی کو دوسرے بھائی کی حیثیت سے۔

مسلمان ابھی تک فطرت کے اس فیصلہ کو قبول نہ کر سکے۔ پچھلے پچاس سال سے مسلمان یہاں کے ہندو کو رقیب کی نظر سے دیکھ رہے ہیں اور ان سے حریفانہ تعلق قائم کیے ہوئے ہیں۔ اس تلخ صورت حال کا سبب ان کا یہی عدم اعتراف ہے۔ اس کے نتیجہ میں مسلمان خود بھی تباہ ہیں اور اسی کے ساتھ وہ ملک کی تباہی کا سبب بھی بن رہے ہیں۔ مگر مسلمانوں کو اچھی طرح جان لینا چاہیے کہ اس معاملہ میں ان کے لیے صرف ایک ہی انتخاب (choice) ہے۔ دوسرا کوئی انتخاب سرے سے یہاں ممکن ہی نہیں۔ وہ واحد انتخاب یہ ہے کہ مسلمان حقیقتِ واقعہ کا اعتراف کرتے ہوئے مسٹر نکسٹ کی پوزیشن قبول کرنے پر راضی ہو جائیں۔ یہی مسلمانوں کے اپنے مسئلہ کا حل بھی ہے اور یہی پورے ملک کے مسئلہ کا حل بھی۔

سیاست ممکن کا فن ہے (Politics is the art of possible) یہ عملی سیاست

کا ایک معروف اصول ہے اور وہ سب سے زیادہ مذکورہ معاملہ پر چسپاں ہوتا ہے۔ مسٹر نکسٹ کے لیے مسٹر نکسٹ کی پوزیشن قبول کرنا درحقیقت ناممکن کے مقابلہ میں ممکن کو اختیار کرنا ہے۔ مسٹر نکسٹ اس معاملہ میں اگر فطرت کے فیصلہ کو قبول نہ کرے تو وہ خود اپنے آپ کو ہر قسم کے نقصان میں مبتلا کرے گا۔ مسٹر نکسٹ کے لیے مسٹر نکسٹ کا رول قبول کرنا خود اپنی ترقی اور کامیابی کا دروازہ کھولنا ہے۔ جو مسٹر نکسٹ ایسا نہ کرے، عملی طور پر وہ سماج کے اندر مسٹر ایجی ٹیٹر بن کر رہ جائے گا۔ اس سے زیادہ اور کچھ وہ حاصل نہیں کر سکتا۔

حقائق کا فیصلہ

کوئی مسلم دانشور یہاں کہہ سکتا ہے کہ انڈیا میں تو ڈیموکریسی ہے۔ پھر ہم کیوں اپنے لیے مسٹر نکسٹ کی پوزیشن قبول کریں۔ میں کہوں گا کہ ڈیموکریسی کسی یوٹوپیا کا نام نہیں۔ ڈیموکریسی میں بھی کسی کو مسٹر نکسٹ بننا پڑتا ہے، اس کے بعد ہی عملی طور پر ڈیموکریسی کا نظام کسی ملک میں قائم ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر پاکستان میں اس وقت ڈیموکریسی ہے۔ مگر ۱۹۹۳ کے الکشن کے بعد نواز شریف کو مسٹر نکسٹ بننا پڑا، اس کے بعد ہی بے نظیر بھٹو کی وزارتِ عظمیٰ کے تحت پاکستان میں ڈیموکریسی کا نظام قائم ہوا۔

دوسری بات یہ کہ زندگی کے معاملات الفاظ کے تابع نہیں ہیں۔ زندگی کے معاملات حقائق کے تابع ہیں۔ خالص اصولی اعتبار سے آئیڈیلزم بہت اچھی چیز ہے۔ مگر یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ زندگی کا عملی نظام ہمیشہ پریگمیٹزم (pragmatism) کی بنیاد پر چلتا ہے۔ یہ تاریخ کا ایک اٹل اصول ہے جس میں کسی بھی نظام کا کوئی استثنا نہیں۔

اس کی ایک متعلق مثال یہ ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم مارچ ۶۳۲ء میں مدینہ سے مکہ گئے اور وہاں حج کا فریضہ ادا کیا۔ اسلام کی تاریخ میں اس کو حجۃ الوداع کہا جاتا ہے۔ اس موقع پر آپ نے اپنے مشہور خطبہ میں (نیز اس سے پہلے بھی) اعلان فرمایا کہ ایک انسان کو دوسرے انسان پر کوئی فضیلت نہیں۔ عربی اور عجمی، اسود اور احمر سب برابر ہیں۔ کوئی حبشی تمہارے اوپر حکمراں بنادیا جائے تب بھی تم اس کی اطاعت کرو۔

اس اعلان کے تقریباً ڈھائی مہینہ بعد ۸ جون ۶۳۲ء کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو بزرگ صحابی ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اعلان کیا کہ خلیفہ صرف قبیلۂ قریش میں سے بنایا جائے گا۔

کیوں کہ اہل عرب قریش کے سوا کسی اور کی سرداری قبول نہیں کر سکتے۔ ایسی حالت میں اگر کسی دوسرے قبیلہ کا آدمی خلیفہ بنایا گیا تو عرب کے لوگ بغاوت کر دیں گے۔ گویا اسلام کے عین دور اول میں خلیفہ کا انتخاب پریگمیٹزم کی بنیاد پر کیا گیا نہ کہ آئیڈیلزم کی بنیاد پر۔

آخری بات

حقیقت یہ ہے کہ فطرت کا یہ اعتراف خود خدا کا اعتراف ہے۔ یہ "مسٹر نکسٹ" بننا انسان کے مقابلہ میں نہیں ہے بلکہ خدا کے مقابلہ میں ہے۔ کیوں کہ وہ خدا کے قانون کے تحت پیش آتا ہے۔ اس اعتبار سے وہ خدا کی اطاعت کے ہم معنی ہے۔ اسی اطاعت میں خالق کائنات نے تمام انسانی ترقیوں کا راز رکھ دیا ہے۔ اسی میں ہماری دنیا کی ترقی بھی چھپی ہوئی ہے اور اسی میں ہماری آخرت کی ترقی بھی۔

واضح ہو کہ فرسٹ اور نکسٹ کے اس معاملہ کا تعلق صرف خارجی ڈھانچہ سے ہے نہ کہ کسی شخص یا گروہ کی واقعی حیثیت سے۔ یہ صرف ایک انتظامی بندوبست کا معاملہ ہے۔ دونوں کے درمیان یہ تقسیم برائے ضرورت ہوتی ہے نہ کہ برائے فضیلت۔ اگر آدمی کی اپنی ذہنی سطح بلند ہو، اگر اس کے پاس فریق ثانی کے مقابلہ میں زیادہ برتر آئیڈیالوجی ہو تو خارجی ڈھانچہ میں بظاہر مسٹر نکسٹ بننے کے باوجود وہ اپنی ذہنی سطح پر اپنے کو مقابلۃً برتر محسوس کرے گا۔ محدود عملی سطح پر مسٹر نکسٹ بننے کے باوجود مستقل فکری سطح پر وہ برتر احساسات کے ساتھ جئے گا۔

فکری طاقت ہی زندگی میں ہمیشہ فیصلہ کن ثابت ہوتی ہے۔ مسٹر نکسٹ کو اگر نظریاتی برتری حاصل ہو تو باہمی تعامل کے دوران خود مسٹر فرسٹ اس کی برتری کو ماننے پر مجبور ہو جائے گا۔ حتی کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ وقتی نظام میں جو فریق مسٹر نکسٹ ہو وہ مستقبل میں مسٹر فرسٹ سے بھی زیادہ اونچا مقام پائے۔ اور جو فریق آج فرسٹ کے درجہ میں دکھائی دے رہا تھا وہ کل کی تاریخ میں سرے سے غیر مذکور ہو کر رہ جائے۔ یہی وہ بات ہے جس کو حضرت مسیح نے ان لفظوں میں کہا ــــــ لیکن بہت سے اول آخر ہو جائیں گے اور آخر اول :

But many that are first shall be last. And the last first. (St. Mark 10:31)

مستقبل کی طرف

۶ دسمبر ۱۹۹۲ کا دن ہندستان کے لیے ایک زلزلہ خیز دن تھا جب کہ اجودھیا کی بابری مسجد کو ڈھانے کا واقعہ پیش آیا۔ بظاہر ایسا محسوس ہونے لگا کہ ہمارا قومی سفر ایک ناقابلِ عبور دلدل میں پھنس کر رہ گیا ہے۔

اس وقت میں نے مسئلہ کے حل کے لیے ایک قابلِ قبول فارمولا پیش کیا۔ یہ کوئی نئی چیز نہ تھی۔ یہ دراصل عبادت گاہوں کے موجودہ ایکٹ (Places of Worship Act 1991) ہی کا نئے الفاظ میں (formulation) تھا۔ جیسا کہ معلوم ہے، پارلیمنٹ کے اس پاس شدہ قانون میں طے کیا گیا تھا کہ ملک کی تمام عبادت گاہوں کو ان کی ۱۵ اگست ۱۹۴۷ کی حالت (statusquo) پر برقرار رکھا جائے گا، باستثنا بابری مسجد (excluding Babri Masjid). اب میں نے صرف یہ کیا کہ اس قانون کی اسپرٹ کو سامنے رکھتے ہوئے اس کو ایک متعین فارمولا کی صورت دے دی۔

۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو مذکورہ قانونی استثنا، (exclusion) وقوع میں آگیا۔ چنانچہ فارمولے میں یہ کہا گیا تھا کہ دیش کے عظیم تر انٹرسٹ کی خاطر دونوں فرقے مذکورہ ایکٹ کو لیٹر اینڈ اسپرٹ کے ساتھ مان لیں۔ دونوں فرقے اس پر راضی ہو جائیں کہ مسلمان بابری مسجد کے سوال پر چپ ہو جائیں گے۔ اور ہندو اس کے بعد بقیہ مسجدوں کے بارہ میں اپنی مانگ کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیں گے۔

ابتدا میں دونوں فریق یہ محسوس کر رہے تھے کہ اس فارمولا کو عمل کی صورت دینے میں کچھ رکاوٹیں حائل ہیں۔ مگر پچھلے ایک سال کے حالات نے ثابت کیا ہے کہ یہ اندیشے درست نہ تھے۔ واقعات کی رفتار پوری طرح اس تجویز کی موافقت میں ہے۔ اب ہم زیادہ بہتر طور پر اس پوزیشن میں ہیں کہ اس نزاع کو آخری طور پر فراموشی کے خانہ میں ڈال دیں۔

مذکورہ فارمولا جب سامنے آیا تو مسلمانوں کی طرف سے عام طور پر یہ کہا گیا کہ نزاع کے خاتمہ کے لیے ہم اس پر راضی ہو سکتے ہیں کہ ہم بابری مسجد کو بھلا دیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ دوسرا فریق تو اس کے بعد بھی بہت سی مسجدوں کی فہرست اپنے ہاتھ میں لیے ہوئے ہے۔ مسلمانوں کے اُردو پریس میں خاص طور پر اس واقعہ کو بہت زیادہ دہرایا گیا کہ ۶ دسمبر کو جو ہجوم بابری مسجد کو ڈھا رہا تھا وہ باآوازِ بلند

یہ اعلان کر رہا تھا : اجودھیا تو جھانکی ہے، متھرا کاشی باقی ہے۔

راقم الحروف نے اس معاملہ میں وسیع پیمانہ پر مسلم طبقات کا جائزہ لیا۔ اس کے نتیجہ میں میں جس رائے پر پہنچا وہ یہ تھی کہ اب مسلمانوں کا (main concern) بابری مسجد نہیں ہے۔ اب ان کی توجہ کا مرکز وہ بقیہ مسجدیں ہیں جن کے بارہ میں دعویٰ کیا جا رہا ہے اور جن کے تحفظ کے بارہ میں مسلمانوں کو پورا اطمینان ابھی تک حاصل نہیں۔

لیکن نومبر ۱۹۹۳ میں ہونے والے ریاستی الکشن نے خوش قسمتی سے مسلمانوں کے اس اندیشہ کا خاتمہ کر دیا ہے۔ جیسا کہ نتائج سے معلوم ہوتا ہے، اس الکشن میں بھارتیہ جنتا پارٹی، دوسری ریاستوں کے ساتھ، خود یوپی میں بھی طاقت ور اکثریت حاصل نہ کر سکی۔ یہ واقعہ واضح طور پر بتا رہا ہے کہ اس معاملہ میں اب ہندو موڈ کیا ہے۔

اتر پردیش کے ٹاؤن اجودھیا میں جب ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو بابری مسجد ڈھائی گئی، اس وقت اتر پردیش میں بی جے پی کی حکومت قائم تھی۔ کم از کم مسلم نقطۂ نظر کے مطابق، بابری مسجد کا انہدام اسی سیاسی فیکٹر کی بنا پر ممکن ہوا۔ اب اگر ہندو کے لیے سب سے زیادہ اہمیت کی چیز یہ ہوتی کہ اس اسٹیٹ میں واقع متھرا اور کاشی کی مسجدوں کا بھی وہی انجام ہو جو اجودھیا کی مسجد کا ہوا ہے تو ریاستی الکشن ہندو کو سنہرا موقع دے رہا تھا کہ وہ بڑے پیمانہ پر اپنی سپورٹ دے کر دوبارہ یوپی میں بی جے پی کی طاقتور حکومت بنائے تاکہ اس کی چاہت کے مطابق بقیہ مسجدوں کا انہدام آسان ہو جائے۔ مگر الکشن کا رزلٹ بتاتا ہے کہ ریاست کے ہندو ووٹروں نے اس تقاضے کو اہمیت نہ دی۔ چنانچہ یوپی اسمبلی میں بی جے پی کوئی طاقتور حیثیت حاصل نہ کر سکی۔ ۴۲۵ سیٹوں کے ایوان میں اس کو صرف ۱۷۷ سیٹ ملی۔

یہ کہنا صحیح ہوگا کہ موجودہ الکشن میں ہندو کمیونٹی نے غیر ملفوظ زبان میں اپنے مسلم بھائیوں سے کہہ دیا ہے کہ تم اطمینان رکھو، اب ہم کسی اور مسجد کا باب کھولنے والے نہیں ہیں۔ اگر ہم کو ایسا کرنا ہوتا تو ہم ضرور بی جے پی کو بھاری اکثریت سے کامیاب کرتے۔ اس معاملہ میں بابری مسجد ہی اول تھی اور وہی آخر بھی۔ "متھرا کاشی باقی ہے" کا نعرہ ہم میں سے چند ناسمجھ لوگوں کا نعرہ تھا۔ وہ عمومی طور پر ہندو کمیونٹی کا نعرہ ہرگز نہیں۔

موجودہ الکشن سے یہ نتیجہ دو اور دو چار کی طرح نکل رہا ہے۔ اس واضح اظہار کے بعد اب کوئی

وجہ نہیں کہ مسلمان بقیہ مسجدوں کے معاملہ میں ہندو کی طرف سے پوری طرح مطمئن نہ ہو جائیں۔

اس سلسلہ میں دوسرا مسئلہ یہ تھا کہ خود ساختہ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ مسلسل یہ مانگ کر رہا تھا کہ بابری مسجد کو دوبارہ وہیں بناؤ۔ یہ لوگ یہ تاثر دے رہے تھے کہ وہ سارے مسلمانان ہند کے نمائندہ ہیں اور تمام مسلمانوں کی طرف سے یہ مطالبہ کر رہے ہیں۔ مگر واقعات نے یہ ثابت کیا ہے کہ اس معاملہ میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ ہرگز مسلمانان ہند کی خواہش کا ترجمان نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ کوشش کے باوجود یہ تنظیم اس عنوان پر ہندستانی مسلمانوں کو دوبارہ متحرک (mobilize) نہ کر سکی جس طرح ۶ دسمبر سے پہلے کچھ تنظیمیں مسلمانوں کو اس عنوان پر متحرک کرنے میں کامیاب ہوئی تھیں۔ بابری مسجد کے نام پر ریلی اور مارچ کی سیاست کو مسلمان اسی طرح چھوڑ چکا ہے جس طرح ہندو مسجد ہٹاؤ مندر لاؤ کی سیاست کو۔

یہ بات پریس میں آچکی ہے کہ ۲۰ نومبر ۱۹۹۳ کو آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی میٹنگ بمبئی میں ہوئی۔ اس میٹنگ میں انھوں نے ملک کے تمام مسلمانوں سے اپیل کی کہ ۳ دسمبر ۱۹۹۳ کو وہ ملک بھر کی مسجدوں میں بابری مسجد کی تعمیر نو کے لیے یوم دعا منائیں۔

یہاں غور کرنے کی بات یہ ہے کہ بابری مسجد کے ڈھائے جانے کا واقعہ ۶ دسمبر کو ہوا تھا۔ اسی لیے آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے ممبران ۶ دسمبر کو دہلی میں جمع ہوئے تاکہ وزیر اعظم ہند کی رہائش گاہ پر پہنچ کر انھیں میمورنڈم دیں۔ ایسی حالت میں یوم دعا کے لیے ۶ دسمبر کو چھوڑ کر ۳ دسمبر کی تاریخ آخر کیوں چنی گئی۔

اس کی سادہ سی وجہ یہ ہے کہ ۳ دسمبر کو جمعہ (مسلمانوں کی ہفتہ وار اجتماعی عبادت) کا دن تھا۔ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے ممبروں کو اچھی طرح معلوم تھا کہ مسلمانوں کو اب بابری مسجد کی تعمیر نو سے کوئی دل چسپی نہیں ہے۔ اور خاص اس کے لیے وہ ۶ دسمبر کو ہرگز ملک کی مسجدوں میں جمع ہونے والے نہیں ہیں۔ اس لیے انھوں نے فرضی مظاہرہ کے مقصد سے ۳ دسمبر کی تاریخ مقرر کی۔ کیوں کہ اس تاریخ کو جمعہ کا دن ہونے کی وجہ سے مسلمان اپنے آپ ہی مسجدوں میں اکٹھا ہوں گے۔ اور اس کو استعمال کر کے بورڈ کے ممبروں کو غلط طور پر یہ کہنے کا موقع مل جائے گا کہ دیکھو تمام ملک کے مسلمان اس معاملہ میں ہمارے ساتھ ہیں۔ اسی لیے تو ہماری کال پر انھوں نے ملک بھر کی

مسجدوں میں جمع ہو کر بابری مسجد کے لیے یوم دعا منایا۔

خلاصہ یہ کہ عبادت گاہوں کے ایکٹ کی مطابقت میں بابری مسجد کے مسئلہ کے حل کے لیے جو فارمولا پیش کیا گیا تھا اب ہندو اور مسلمان دونوں عملاً اسی پر قائم ہو چکے ہیں۔ اس طرح گویا دونوں فریقوں کے درمیان ایک قسم کا بلا اعلان ایگریمنٹ واقع ہو چکا ہے۔ ضرورت صرف یہ ہے کہ شعوری طور پر اس حقیقت کا اعتراف کر کے اس نزاع کا بالاعلان خاتمہ کر دیا جائے تاکہ دیش کا ترقی کی طرف سفر کسی رکاوٹ کے بغیر دوبارہ شروع ہو جائے۔

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو، ہندی اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ ہندی اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (ہندی اور انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارِ نبوت ہے اور ملت کے اوپر سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو، ہندی یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ ۱۰۰ پرچوں سے زیادہ تعداد پر کمیشن ۳۳ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں، اور صاحبِ ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کر دے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

مردان کار کی ضرورت

انڈیا برٹش اقتدار سے ۱۹۴۷ میں آزاد ہوا۔ مگر برٹش اقتدار کے خلاف انڈیا کی جنگ آزادی اس سے بہت پہلے شروع ہو چکی تھی۔ ۱۷۹۹ میں سلطان ٹیپو برٹش فوجوں سے لڑتے ہوئے قربان ہو گئے۔ ۵۸ - ۱۸۵۷ میں برٹش اقتدار کے خلاف مسلح بغاوت ہوئی لیکن انگریزوں نے اس کو ناکام بنا دیا۔ اس طرح کی مسلح لڑائیاں انگریزوں کے خلاف ڈیڑھ سو سال تک کسی نہ کسی صورت میں جاری رہیں۔ مگر ہندستانیوں کی یک طرفہ تباہی کے سوا ان کا کوئی اور نتیجہ برآمد نہ ہو سکا۔

مہاتما گاندھی ۱۹۱۹ میں ساوتھ افریقہ سے انڈیا واپس آئے۔ اور انڈین نیشنل کانگریس میں شریک ہو گئے جو ۳۵ سال پہلے کچھ آزادی پسند لوگوں نے قائم کی تھی۔ مہاتما گاندھی نے ہندستان کی تحریک آزادی میں ایک نئے اصول ستیہ گرہ کا اضافہ کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہاں کی سیاست میں ایک زلزلہ آ گیا :

He announced a Satyagraha struggle. The result was a virtual political earthquake that shook the subcontinent in the spring of 1919. (7/876)

مہاتما گاندھی سے پہلے انڈیا کی تحریکِ آزادی تشدد (violence) کے اصول پر چل رہی تھی۔ آزادی کی مانگ کرنے والے انگریزوں کے اوپر تشدد کرتے تھے۔ اس کے جواب میں انگریز اور زیادہ تشدد کر کے ان کو کچل دیتے تھے۔ مہاتما گاندھی نے اعلان کیا کہ ہم اپنی آزادی کی تحریک کو عدم تشدد (non-violence) کی بنیاد پر چلائیں گے۔ انھوں نے بم اور گولی کو پھینک دیا اور اس کے بجائے ہندستانی عوام کو بیدار کرنا شروع کر دیا۔

اس نئی تحریک نے انگریزی حکومت کو بے بس کر دیا۔ اس سے پہلے وہ تشدد کو توڑنے کے لیے تشدد کا طریقہ اختیار کیے ہوئے تھے۔ مگر مہاتما گاندھی کی اہنسا نے انگریزوں سے تشدد کا جواز چھین لیا۔ چنانچہ اسی زمانہ کا ایک لطیفہ ہے کہ ایک انگریز کلکٹر نے اپنے سکریٹریٹ کو ٹیلی گرام بھیجا کہ براہ کرم یہ بتائیے کہ ایک شیر کو تشدد کے بغیر کس طرح ہلاک کیا جائے :

Kindly wire instructions how to kill a tiger non-violently?

مہاتما گاندھی نے عدم تشدد کے طریقہ کو اختیار کر کے ۱۵ اگست ۱۹۴۷ کو سیاسی آزادی حاصل کر لی۔ مگر آج ہم محسوس کرتے ہیں کہ ان کا اصل مشن پورا نہیں ہوا۔ مہاتما گاندھی نے کہا تھا کہ میرا مشن ہر آنکھ کے آنسو پونچھنا ہے۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ رونے والوں کے آنسو پونچھے نہ جا سکے۔ بلکہ آزادی کے بعد رونے والی آنکھوں میں کچھ اور آنکھوں کا اضافہ ہو گیا۔

آزادی کے بعد مہاتما گاندھی ایک اور اندولن چلانے والے تھے۔ یہ نئے ہندستان کی تعمیر کا اندولن تھا۔ مگر وہ اپنے مشن کے دوسرے مرحلہ کو پورا نہ کر سکے۔ ۳۰ جنوری ۱۹۴۸ کو دہلی میں ایک انتہا پسند نوجوان کی گولی نے قبل از وقت ان کا خاتمہ کر دیا۔

اب ہمیں ایک اور گاندھی کی ضرورت ہے۔ پہلے گاندھی نے ۱۹۴۷ سے قبل تحریکِ آزادی کو تشدد کے راستہ سے ہٹا کر عدم تشدد کے راستہ پر ڈال دیا تھا۔ دوسرے گاندھی کو اسی قسم کی تبدیلی کا ایک زیادہ مشکل کام انجام دینا ہے۔ یہ کام ہے ——— اہل ملک کے لیے ذاتی انٹرسٹ کے بجائے نیشنل انٹرسٹ کو سپریم بنا دینا۔

آزادی کے بعد نئے ہندستان کے بارہ میں ہمارا خواب پورا نہ ہو سکا۔ اس کی واحد سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ۱۹۴۷ سے پہلے قومی آزادی لوگوں کا مقصد تھا۔ آزادی کے بعد قومی انٹرسٹ کو لوگوں کا مقصد بن جانا چاہیے تھا۔ مگر عملاً یہ ہوا کہ اس کے بجائے ذاتی انٹرسٹ لوگوں کا نشانہ بن گیا۔ تعمیر خویش کی بڑھی ہوئی حرص میں تعمیر وطن کا کام انجام پانے سے رہ گیا۔

دوسری عالمی جنگ کے بعد جاپان نے اپنی نئی زندگی شروع کی۔ اور اسی کے بعد انڈیا نے بھی اپنی نئی زندگی شروع کی۔ آج جاپان اس حد تک ترقی کر چکا ہے کہ اس کو اقتصادی سپر پاور کہا جاتا ہے۔ جب کہ انڈیا عالمی اقتصادی نقشہ میں سب سے نیچے جگہ پائے ہوئے ہے۔ اس فرق کا سبب دونوں کے مزاج کا فرق ہے۔ جاپانیوں کے نزدیک جاپان کا نیشنل انٹرسٹ سپریم حیثیت رکھتا ہے اور ان کا ذاتی انٹرسٹ اس کے مقابلہ میں صرف سکنڈری ہے۔ انڈیا میں صورت حال اس کے برعکس ہے۔ یہاں کے انسان کے لیے اس کا ذاتی انٹرسٹ اول بن گیا ہے اور نیشنل انٹرسٹ کی حیثیت صرف ثانوی ہو کر رہ گئی ہے۔

۱۹۴۷ سے پہلے ملک کے سامنے سیاسی ڈھانچہ کی تبدیلی کا نشانہ تھا۔ ۱۹۴۷ کے بعد ذہنی

ڈھانچہ کی تبدیلی کا نشانہ ہمارے سامنے ہے۔ پہلے مسئلہ کے مقابلہ میں دوسرا مسئلہ یقیناً زیادہ مشکل ہے۔ لیکن اگر جاپان اور دوسری ترقی یافتہ قوموں نے اس دوسری تبدیلی کے میدان میں کامیابی حاصل کر لی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم اس تبدیلی کو اپنے ملک میں لانے میں کامیاب نہ ہو سکیں۔

آج انڈیا کو ایک نئے گاندھیائی اندولن کی ضرورت ہے جو انڈیا میں اس دوسری تبدیلی کو واقعہ بنا سکے۔ جو لوگوں کی سوچ کو بدلے۔ جو ذاتی انٹرسٹ پر چلنے والوں کو قوم کے انٹرسٹ پر چلنے والا بنا دے۔ یہ ملک کے مستقبل کے لیے انتہائی ضروری ہے۔ آرنلڈ ٹوائن بی نے بالکل درست کہا ہے کہ کسی تہذیب نے اخلاقی اور روحانی احیاء کے بغیر کبھی ترقی نہیں کی :

No civilization has flourished without a moral and spiritual renaissance.

نئے انڈیا کی تعمیر بھی دوبارہ طریق عمل کی ایک تبدیلی کا تقاضا کر رہی ہے۔ ۱۹۴۷ کے بعد جن لوگوں کے ہاتھ میں انڈیا کی قسمت آئی، انھوں نے نئے انڈیا کی تعمیر کے لیے جس نسخہ کا تجربہ کیا وہ ڈھانچہ (system) کی تبدیلی تھی۔ اب ہمیں اس کے بجائے فرد (individual) میں تبدیلی کو اپنا نشانہ بنانا ہے۔

پچھلے ۴۵ سال میں سماجی زندگی کے تمام شعبوں کو بار بار بدلا جاتا رہا ہے۔ اس سلسلہ میں اتنے قوانین بنائے گئے ہیں کہ اب بنانے والوں کو بھی اس کی گنتی کا علم نہیں۔ مگر عملی حالات میں کوئی بھی بہتری نہ ہو سکی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر ڈھانچہ کو آخر کار جو کنٹرول کرتا ہے وہ ایک انسان ہے۔ اور انسان کو بدلنے کا کام سرے سے ہمارے یہاں نہیں ہوا۔

انسان کو بدلنے سے مراد انسان کی سوچ کو بدلنا ہے۔ انسان کو صحیح رخ پر سوچنے والا بنانا ہے۔ مثلاً بابری مسجد کے معاملہ میں ہندو اور مسلمان دونوں غلط فکری کا شکار ہوئے۔ مسلم لیڈروں نے اس اشو کو مقامی دائرے سے نکال کر آل انڈیا اشو بنایا۔ اس طرح انھوں نے ایک سادہ اور چھوٹے اشو کو بڑھا کر پوری اکثریتی کمیونٹی کے لیے پرسٹیج اشو بنا کر اس کی پیچیدگی میں اضافہ کر دیا۔

دوسری طرف انتہا پسند ہندوؤں نے سمجھا کہ وہ اس پوزیشن میں ہیں کہ تاریخ کی تصحیح کر سکیں۔ انھوں نے تاریخ کی تصحیح کے نام پر بابری مسجد کو ڈھا دیا۔ مگر ڈھانے کے بعد انھیں معلوم

ہوا کہ وہ ماضی کی درستگی کے نام پر صرف حال کی بربادی کا کام انجام دے رہے تھے۔

نیا گاندھیائی رول اتنا ہی ممکن ہے جتنا کہ پہلا گاندھیائی رول ممکن تھا۔ تاہم دونوں کے درمیان ایک بنیادی فرق ہے۔ پہلا گاندھی ہیروازم کی بنیاد پر اٹھا تھا، دوسرے گاندھی کو زیروازم کی بنیاد پر اٹھنے کا حوصلہ کرنا ہوگا۔ اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ پہلا گاندھیائی رول بنیادی طور پر ایک سیاسی رول تھا جو غیر قوم کے خلاف ادا کیا گیا، دوسرا گاندھیائی رول بنیادی طور پر ایک غیر سیاسی رول ہے جس کو خود اپنی قوم کے اوپر ادا کرنا ہے۔ اور تاریخ کا اور خود گاندھی کا تجربہ بتاتا ہے کہ دوسروں کے خلاف بولنے والے کا استقبال پھولوں سے کیا جاتا ہے اور اپنوں کو مخاطب کرنے والے کا استقبال گولیوں سے۔

جو شخص آج دوسرے گاندھی کا رول ادا کرنے کے لیے اٹھے اس کو پیشہ ور ریاست دانوں (career politicians) کا طریقہ چھوڑ دینا ہوگا۔ وہ عوامی رجحان کے بجائے اصول کو اپنے سامنے رکھے گا۔ وہ اپنے فرقہ کے مفاد کے لیے بولنے کے بجائے قوم کے مفاد کے لیے بولے گا۔ وہ علاقائی خواہشات کے بجائے ملک کی وسیع تر مصلحتوں کو اپنا نشانہ بنائے گا۔ وہ ذاتی خوش نامی کو نظر انداز کر کے سچائی کا اعلان کرے گا۔ وہ وقتی تقاضوں کے بجائے مستقبل کے تقاضوں کو اہمیت دے گا۔

یہ چیزیں اس کو ہیرو شخصیت کے بجائے زیرو شخصیت بنا دیں گی۔ مگر دوسرا گاندھی بننے کی یہی واحد قیمت ہے اور جب تک ایسے حوصلہ مند افراد نہ اٹھیں دوسرے گاندھیائی کردار کی ادائگی بھی اس دیش میں ممکن نہیں۔

مہاتما گاندھی ۱۹۱۹ میں کانگریس پارٹی میں شریک ہوئے۔ اس وقت انڈیا کی سیاست پر بال گنگا دھر تلک چھائے ہوئے تھے۔ تلک ہائی پروفائل میں بولنا پسند کرتے تھے۔ اس کے مقابلہ میں مہاتما گاندھی ہمیشہ لو پروفائل میں بولتے تھے۔

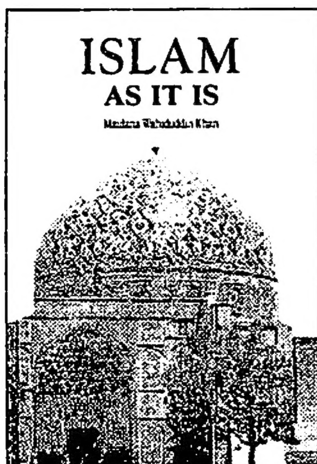
۱۱ اگست ۱۹۷۳ کو میری ملاقات نئی دہلی میں پرنسپل نرنجن سنگھ سے ہوئی تھی۔ وہ ۱۹۱۹ کے اس امرتسر اجلاس میں موجود تھے جس میں مہاتما گاندھی شریک ہوئے۔ نرنجن سنگھ نے مجھے بتایا کہ کانگریس کے اس تاریخی اجلاس میں تلک، موتی لال، اینی بسنٹ، محمد علی جناح وغیرہ موجود تھے۔

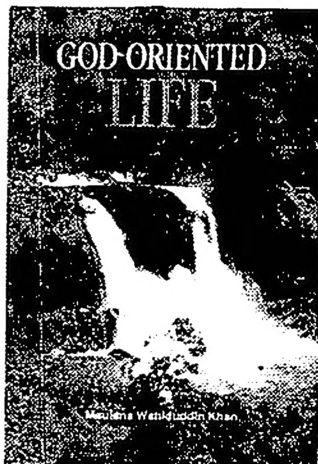
بڑے بڑے لیڈروں کے اس ماحول میں گاندھی جی بظاہر دیکھنے میں اتنے غیر اہم معلوم ہوتے تھے کہ اسٹیج پر ان کو دیکھ کر اسکول کے لڑکوں نے کہا : یہ گھاس کاٹنے والا کہاں سے آگیا۔

تلک نے اس اجلاس میں مکمل سوراج کا رزولیوشن پیش کیا۔ دوسرا رزولیوشن گاندھی جی کا تھا۔ اس میں ڈومی نین اسٹیٹس کی تجویز رکھی گئی تھی۔ تقریروں کے بعد ووٹنگ ہوئی تو تلک کو ۱۲۳ ووٹ ملے۔ اس کے مقابلہ میں گاندھی جی کو صرف چار ووٹ زیادہ ملے۔ ان کا رزولیوشن ۱۲۷ ووٹ سے منظور ہوا۔ اس وقت گاندھی کی یہ جیت اتنی عجیب تھی کہ جب نتیجہ کا اعلان ہوا تو لڑکوں نے نعرہ لگایا : وہ گھسیارا جیت گیا، وہ گھسیارا جیت گیا۔

یہ دورِ غلامی کی بات ہے۔ دورِ آزادی میں جو شخص گاندھی کا رول ادا کرنے کے لیے اٹھے گا اس کو مزید اضافہ کے ساتھ ہائی پروفائل کا اسلوب چھوڑنا ہوگا اور آخری حد تک لو پروفائل کے اسلوب کو اختیار کرنا ہوگا۔ حتی کہ عین ممکن ہے کہ اس عمل کے دوران لوگوں کی نظر میں وہ مسٹر جیت کے بجائے مسٹر ہار بن جائے۔ اور اس کے بارہ میں اسکول کے لڑکے یہ نعرہ لگائیں : مسٹر جیت گھسیارا بن گئے، مسٹر جیت گھسیارا بن گئے۔

انڈیا کی تعمیر نو کے لیے آج ایسے ہی مردان کار کی ضرورت ہے۔ ایسے ہی لوگوں نے قوموں کا مستقبل بنایا ہے اور ایسے ہی لوگ ہوں گے جو انڈیا کا مستقبل تعمیر کریں گے۔





ISLAM AS IT IS

By Maulana Wahiduddin Khan

Pages 114 Rs. 40

In *Islam As It Is,* Maulana Wahiduddin Khan presents the fundamental teachings of Islam in a manner which will appeal directly to both general readers and students of Islam.

Simple and straightforward in style, *Islam As It Is* gives the reader an accurate and comprehensive picture of Islam — the true religion of submission to God.

GOD-ORIENTED LIFE

By Maulana Wahiduddin Khan

Pages 186 Rs. 60

The traditions – Sunnah – of the Prophet Muhammad, upon whom be peace, and the lives of his companions and those closely associated with them, serve as a major source of religious enlightenment in theory and in practice. This book endeavours to present these ideas in the simplest and most direct way. In that it culls from authentic sources the sayings and deeds of the Prophet and those inspired by him, it brings to us a complete and, above all, human picture of true Islamic behaviour.

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر



AL-RISALA BOOK CENTRE
1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110013
Tel : 4611128, 4697333 Fax : 91-11-4697333